امیر حمزہ کوہ قاف میں

امیر حمزہ کوہ قاف میں

داستان امیر حمزہ

حصّہ پنجم

مقبول جہانگیر

عفریت دیو کی مَوت

اِس حیرت انگیز داستان کے چوتھے حصّے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ امیر حمزہ آسمان پری کی درخواست پر کوہ قاف جاتے ہیں۔ وہاں عفریت دیو نے آسمان پری کی سلطنت چھین لی ہے اور خود حکومت کر رہا ہے، پریاں امیر حمزہ کو ایک باغ میں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ وہاں اُن کی لڑائی ایک دیو سے ہوتی ہے۔ امیر حمزہ دیو کو تلوار سے زخمی کرتے ہیں اور وہ تڑپتے ہُوئے کہتا ہے کہ اے آدم زاد ایک وار اور کر تا کہ میری جان جلد جسم سے نکلے اور میں اِس تکلیف سے نجات پاؤں۔ امیر حمزہ ایک اور وار کرتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ زخمی دیو دوبارہ تن درست ہو کر لڑنے لگتا ہے۔

امیر حمزہ اُسے کئی بار زخمی کرتے ہیں مگر زخمی ہونے کے بعد وہ خوشامد سے کہتا

ہے کہ اے آدم زاد ایک وار اور کرتا کہ میری جان جلد جسم سے نکلے اور میں اِس تکلیف سے نجات پاؤں۔ لیکن امیر حمزہ جب دوسرا وار کرتے ہیں تو دو پھر ٹھیک ہو کر لڑنے لگتا ہے۔ اِسی طرح صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے۔ آخر دیو امیر حمزہ سے کہتا ہے کہ تھوڑی دیر آرام کر لینے دو، تم بھی تھک گئے ہو اور میں بھی تھک چکا ہوں۔ تھکن دُور کرنے کے بعد دوبارہ لڑائی شروع کریں گے۔ امیر حمزہ اس کی یہ درخواست مان لیتے ہیں۔ لڑائی بند ہو جاتی ہے اور دونوں آرام کرنے لگتے ہیں۔

ہماری یہ نئ کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

امیر حمزہ ایک گھنی جھاڑی کے قریب جا لیٹے۔ تلوار چلا چلا کر اُن کے بازو شل ہو چکے تھے اور پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے مگر وہاں پینے کے لیے پانی کی بوند تک نہ تھی۔ یُوں بھی امیر حمزہ کی بھُوک پیاس اس حیرت اور خوف نے اُڑا دی تھی کہ زخمی دیو دوسرا وار ہوتے ہی تازہ دم کیسے ہو جاتا ہے۔ وُہ دِل میں کہنے لگے کہ اِس طرح تو میں اپنے دشمن کو کبھی ہلاک نہیں

کر سکوں گا۔ ابھی اِسی فکر میں گم تھے کہ یکایک ایک جانب سے آواز آئی:

"اے امیر حمزہ تجھ پر سلام۔"

امیر حمزہ نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک دراز قد اور نورانی شکل کے بزرگ کچھ فاصلے پر کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ امیر حمزہ تنظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سلام کا جواب دیا اور ادب سے کہنے لگے: "حضرت، آپ کون ہیں؟"

وہ بزرگ آگے بڑھے اور امیر حمزہ کو گلے لگا کر بولے۔ "اِتنی جلدی مجھے بھُول گئے؟ میر نام خضر ہے۔ بھُولے بھٹکے کو راستہ بتاتا ہوں۔ تُم اِس وقت سخت آفت میں گھِرے ہوئے ہو، اس لیے خُدا نے مُجھے حکم دیا ہے کہ تمھیں اِس مصیبت سے نجات پانے کی تدبیر بتاؤں۔ مگر پہلے تم کچھ کھالو۔"

یہ کہہ کر حضرت خضر نے دستر خوان بچھایا۔ تازہ روٹیاں اور مچھلی کے کباب دستر خوان پر رکھے۔ امیر حمزہ نے اپنی زندگی میں ایسا مزے دار کھانا نہ کھایا تھا۔ اُنھوں نے جلدی جلدی پیٹ بھرا۔ پھر حضرت خضر نے اپنے مشکیزے

سے پانی نکال کر پلایا۔ امیر حمزہ نے خُدا کا شکر ادا کیا اور کہنے لگے۔ "حضرت، آپ کی مہربانیوں کا بدلہ میں قیامت تک ادا نہیں کر سکتا۔ اب مجھے وہ بات بتایئے جس پر عمل کر کے مَیں اِن دیوؤں اور خبیثوں پر فتح حاصل کر سکوں۔"

"اے فرزند، اِس کی ترکیب بہت آسان ہے۔" خِضرؑ نے کہا "جب کوئی دیو زخمی ہونے کے بعد تم سے کہے کہ ایک وار اور کرو، اُس وقت اُس کی بات ہرگز نہ سُننا اور دُوسرا وار کبھی نہ کرنا۔ وہ دیو خود بخود پتھّر سے سر ٹکرا کر مر جائے گا۔"

یہ نصیحت کر کے حضرت خضر وہاں سے غائب ہو گئے۔ اتنے میں اُس دیو نے للکار کر امیر حمزہ سے کہا۔ "اے آدم زاد، بہت آرام کر چُکا۔ اب لڑنے کے لیے تیّار ہو جا۔ تیری موت کا وقت آن پہنچا۔"

یہ سُن کر امیر حمزہ ہنسے اور بولے: "اے دیو۔ میں نے تجھ پر بڑا ترس کھایا اور کئی بار تجھے زندہ چھوڑا مگر اب جان لے کہ تیرا آخری وقت قریب ہے۔"

یہ کہہ کر تلوار اُٹھائی اور دیو پر حملہ کیا۔ دیو لہُولہان ہو کر زمین پر گِرا اور چلّا کر کہا۔ ”اے آدم زاد، واقعی تُو بہادُر ہے۔ تُو نے مُجھے زیر کر لیا۔ ایک احسان کر کہ تلوار مار کر میری گردن الگ کر دے تاکہ میں جسم کی قید سے آزاد ہو جاؤں۔“

امیر حمزہ نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: ”اب میں تیری بات ہرگز نہ مانوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک اور وار کرنے سے تو دوبارہ لڑنے کے قابل ہو جائے گا۔“

یہ سُن کر دیو رونے اور گڑگڑانے لگا۔ مگر امیر حمزہ نے ایک نہ سُنی۔ آخر وہ ایک بڑے پتھّر سے سر ٹکرا کر مر گیا۔ اتنے میں دیوؤں کی ایک جماعت اُدھر آ نکلی۔ اُنھوں نے جب اپنے ایک ساتھی دیو کو خون میں لت پت مَرے ہوئے پایا تو وہ چیخنے چلّانے لگے۔ پھر اُنھوں نے امیر حمزہ کو دیکھا اور حیران ہو کر کہنے لگے:

”اے آدم زاد، سچ بتا کہ تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور اِس دیو کو کِس نے

مارا ہے؟"

"میرا نام حمزہ ہے اور میں نے ہی اِس دیو کو ہلاک کیا ہے۔"

اِتنا سُننا تھا کہ دیوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ پھر اُنہوں نے بڑے بڑے پتھّر اُٹھائے اور امیر حمزہ کی طرف پھینکے ان میں سے ہر پتھّر کا وزن سو من سے زیادہ تھا امیر حمزہ جان بچانے کے لیے جھاڑیوں میں چھُپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیوؤں نے اُنہیں تلاش کر لیا اور تلواریں اور خنجر نکال کر جھپٹے۔ مگر آناً فاناً امیر حمزہ نے کئی دیوؤں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر دیو ڈر کے پیچھے ہٹ گئے اور اُنہوں نے اپنے بادشاہ عفریت دیو کو خبر پہنچائی کہ انسانوں کی دنیا سے ایک آدم زاد آیا ہے۔ اپنا نام حمزہ بتاتا ہے اور اُس نے ہمارے کئی بہادر دیو مار ڈالے ہیں۔

عفریت دیو غیظ و غضب میں مُنہ سے آگ برساتا ہوا آیا۔ دیکھا کہ ایک خوب صورت آدم زاد باغ کے بیچ میں کھڑا تلوار گھُما رہا ہے۔ قریب ہی پانچ چھ زخمی دیو پڑے ہیں اور چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں:

”اے آدم زاد ایک وار اور کر کہ ہم جلد اِس تکلیف سے نجات پائیں۔“

عفریت نے بھی امیر حمزہ سے وہی سوال کے جو اُس سے پہلے دوسرے دیو پوچھ چُکے تھے اور حمزہ نے اُسے بھی وہی جواب دیا جو پہلے دیوؤں کو دیا تھا۔ تب عفریت نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ کر اِس آدم زاد کو مار ڈال۔

ناگہاں ایک دیو جس کا رنگ توے کی سیاہی کو شرماتا تھا اور جس کا قد بارہ گز کے لگ بھگ تھا، چالیس من وزنی کلہاڑا لے کر اُچھلتا کودتا نمودار ہوا۔ اُس کے پیروں کی دھمک سے باغ کی زمین کانپنے لگی، درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خوف زدہ ہو کر اُڑے اور فضا میں چکّر کاٹنے لگے۔ دیو کی آنکھوں سے شُعلے نِکل رہے تھے اور اُس کی لال لال زبان مُنہ سے باہر لٹکی ہُوئی تھی۔

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں، پھر بادل کی طرح گرج کر بولا۔

”اے آدم زاد خبر دار ہو کہ تیری موت آن پہنچی۔“

یہ کہہ کر اُس نے کلہاڑا گھمایا۔ ہوا میں ایک زنّاٹے دار آواز پیدا ہوئی۔ امیر حمزہ نے اپنے آپ کو اُس کے کلہاڑے کی زد سے بچایا، پھر اُچھل کر تلوار سے اُس کا وہ ہاتھ کاٹ ڈالا جب میں اُس نے کلہاڑا پکڑ رکھا تھا۔ ہاتھ کٹتے ہی خُون کا ایک اُونچا فوّارہ اُچھلا اور کلہاڑا بہت سے دیوؤں کو زخمی کرتا ہوا کافی دُور جا گِرا۔

عفریت کا ماتحت بُری طرح چلّایا۔ زمین پر دھم سے گِرا اور کہنے لگا:

"اے آدم زاد، جلدی سے میری گردن اُڑا دے تاکہ اِس تکلیف سے نجات پاؤں۔"

امیر حمزہ نے قہقہہ لگایا اور بولے: "اب میں اِس فریب میں کبھی نہ آؤں گا۔ پتھّر سے اپنا سر ٹکراؤ اور مر جاؤ۔"

دیو نے دوسرا وار کرنے کی بڑی التجا کی لیکن امیر حمزہ کو حضرت خضرؑ کی نصیحت یاد تھی اِس لیے چُپ چاپ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر دیو نے ایک پتھّر

سے اپنا سر ٹکرایا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی اور وُہ اُسی وقت مر گیا۔

یہ تماشا دیکھ کر عفریت کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے دیوؤں کو حکم دیا کہ اس آدم زاد پر ٹوٹ پڑو اور اِس کی تِکّا بوٹی کر ڈالو۔ چاروں طرف سے دیو امیر حمزہ پر جھپٹے لیکن وُہ ذرا نہ گھبرائے۔ اب اُنہوں نے بے تحاشا تیر برسانے شروع کیے۔ کوئی تیر خالی نہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے باغ میں ہر طرف خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ بے شمار دیو مارے گئے اور اکثر بھاگ نکلے۔ خود عفریت دیو نے بھی بڑی مُشکل سے اپنی جان بچائی۔

عفریت یہاں سے سیدھا اپنے محل میں گیا اور ایک بوڑھے دیو کو بُلایا جو حضرت سلیمانؑ کے زمانے کا تھا۔ اُس سے سارا حال کہا۔ بوڑھا دیو چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ہاتھ باندھ کر کہنے لگا:

"اے بادشاہ، اِس آدم زاد کو مارنا کِسی دیو کے بس میں نہیں ہے۔ میں نے حضرت سلیمانؑ سے سُنا تھا کہ آخری زمانے میں ایک آدم زاد، جِس کا نام حمزہ ہو گا، انسانوں کی دنیا سے نکل کر کوہ قاف میں آئے گا۔ اُس کی تلوار اور

تیروں سے ہزاروں دیو مارے جائیں گے اور تو خود بھی اُسی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی آدم زاد ہے۔"

یہ سُن کر عفریت اور طیش میں آیا۔ سوچے سمجھے بغیر اُس نے ایک بڑا سا پتھّر اُٹھایا اور بوڑھے دیو کے سر پر دے مارا۔ وہ بے چارا مُنہ سے آواز نکالے بغیر فوراً مر گیا۔

اُدھر امیر حمزہ بھی عفریت کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں بہت سے دیوؤں نے اُن کا راستہ روکنے کی کوشِش کی لیکن اُنھوں نے سب کو کاٹ کر ڈال دیا۔ اس کے بعد دیوؤں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے پہاڑوں اور ویرانوں کی طرف بھاگ نکلے۔

عفریت دیو کا محل آسمان سے باتیں کرتا تھا اور اُس کی سب سے اُونچی چھت پر ایک عالی شان مینار بنا ہُوا تھا۔ عفریت ڈر کے مارے اُس مینار کے اندر جا چھُپا اور اندر داخل ہونے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ پھر اُس نے جادو کے زور سے بڑے بڑے وزنی پتھّر امیر حمزہ کے اُوپر پھینکنے شروع کیے۔ مگر حمزہ کا

بال بھی بیکا نہ ہُوا اور وہ محل کے اندر گھُسنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

اچانک پریوں کا ایک گروہ حاضر ہوا۔ اُنہوں نے امیر حمزہ کو سلام کیا اور آسمان پری کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگیں: "اے امیر، اِس محل میں داخل ہونے کی صورت اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ اپنی تلوار سے اپنے بائیں ہاتھ میں تھوڑا سا شگاف دیں۔ پھر اس خُون پر اِسمِ اعظم پڑھ کر محل کے دروازوں پر چھڑک دیں۔ فوراً سب دروازے کھُل جائیں گے۔"

امیر نے جلدی سے بائیں ہاتھ میں شگاف دیا۔ سُرخ سُرخ خُون اُبل پڑا۔ اُنہوں نے اسمِ اعظم پڑھ کر اُس خُون پر دم کیا اور عفریت کے محل کے دروازوں پر چھڑک دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ایک زبردست زلزلہ آ گیا ہو، زمین تھر تھر کانپنے لگی، پہاڑوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ درخت زمین پر جھُک گئے اور آسمان کا رنگ گہرا سُرخ ہو گیا۔ پھر آندھی کے آثار دکھائی دیئے۔ شور اتنا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

یکایک امیر حمزہ نے دیکھا کہ محل کے دروازے کھُل گئے ہیں اور اندر سے بے

شمار دیو نِکل نِکل کر فضا میں اُڑ رہے ہیں۔ اُن کی شکلیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ اُن کے رنگ بھی الگ الگ تھے۔ کوئی پیلا، کوئی نیلا اور کوئی کالا۔ سُرخ رنگ کے دیو بھی بہت تھے۔

عفریت نے جب امیر حمزہ کو محل کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو بہت گھبر ایا اور وہاں سے بھاگنا چاہا۔ مگر حمزہ نے اُسے بھاگنے کی مہلت نہ دی اور راستہ روک لیا۔ تنگ آکر عفریت نے لڑنا شروع کر دیا اور اِس بہادری سے لڑا کہ امیر حمزہ کے دِل سے بھی آفرین نکلی۔ مگر دو گھنٹے کی لگاتار لڑائی کے باوجود عفریت دیو امیر حمزہ پر فتح نہ پا سکا۔ آخر اُنہوں نے اپنی تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔ اُسی وقت وہ زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ پھر اُس نے کہا:

"اے حمزہ، ایک وار اور کرتا کہ میری جان جلد جسم سے نکلے۔"

"ایسا کام مُجھ سے نہ ہو گا۔" امیر حمزہ نے ہنس کر کہا۔ "وہ دیکھو ایک بڑا سا پتھّر تمہارے قریب ہی پڑا ہے۔ اُس سے اپنا سر ٹکراؤ اور مر جاؤ۔"

یہ سُن کر عفریت مایوس ہوا اور آخر کار اُسی پتھّر سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر گیا۔

عفریت کے مرتے ہی آسمان ایک دم تاریک ہو گیا۔ بڑی خوف ناک آندھی آئی اور محل خُشک پتّے کی طرح کانپنے لگا۔ عین اُسی وقت دس ہزار پریاں نمودار ہوئیں اور اُن کے آتے ہی یہ آندھی دُور ہو گئی۔ تمام پریوں نے امیر حمزہ کے قدموں پر سر رکھ کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور طرح طرح کی نعمتیں اور میوے اُن کے سامنے رکھے۔ امیر حمزہ نے جی بھر کر یہ میوے کھائے اور جواہرات کے بنے ہوئے پیالوں میں لذیذ شربت پیا۔

امیر حمزہ نے آسمان پری کو اُس کی سلطنت سونپی، تمام دیوؤں سے وعدہ لیا کہ وہ آیندہ بغاوت نہ کریں گے اور آسمان پری کا حکم مانیں گے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے آسمان پری کے وزیر سلاسل سے کہا کہ کوہ قاف میں ہمارے آنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے اب تُم ہمیں فوراً مکّے پہنچاؤ کیوں کہ اپنے دوستوں کو دیکھے ہُوئے بہت دن گُزر گئے ہیں۔ ہمیں اُن کی یاد ستا رہی ہے۔

وزیر سلاسل نے ہاتھ باندھ کر ادب سے عرض کیا ”حضور کا ارشاد سر

آنکھوں پر ہماری خواہش تو یہ تھی کہ آپ کُچھ دِن اور کوہ قاف میں قیام فرماتے مگر ہماری اتنی مجال نہیں کہ زور دے کر آپ کو روک سکیں۔ ہماری صرف اتنی درخواست ہے کہ کبھی کبھی ہمیں ملاقات کا موقع عطا فرماتے رہا کریں۔"

"بے شک۔ جب تمہارا جی چاہے یاد کر لینا۔ ہم اُسی وقت آ جائیں گے۔" امیر حمزہ نے کہا۔

تب سلاسل نے بہت سے دیوؤں کو طلب کیا اور اُن سے پوچھا کہ امیر حمزہ کو کتنے عرصے میں مُلکِ عرب پہنچاؤ گے؟ کِسی نے کہا تین دِن میں اور کسی نے کہا دو دن میں۔ آخر میں ایک کالے دیو نے گردن جھُکا کر کہا:

"حضور! یہ غلام آپ کو ایک دن کے اندر اندر مکّے پہنچا دے گا۔"

یہ سُن کر وزیر سلاسل نے اُسی دیو کو حکم دیا کہ امیر حمزہ کو حفاظت سے مکّے پہنچاؤ۔ اس وقت امیر حمزہ پروں سے رُخصت ہوئے۔ آخر میں آسمان پری

نے روتے ہوئے اُن کے پیروں کو چُوما اور کہا۔

"حضور، یہ ہماری خُوش نصیبی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے اور ہمارے دشمنوں کو جہنّم رسید کیا۔ ہمارا رُواں رُواں آپ کا احسان مند ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک عجیب تحفہ پیش کروں۔"

یہ کہہ کرے آسمان پری امیر حمزہ کو اپنے ساتھ محل میں لے گئی اور خزانے کے پاس لے جا کر کہنے لگی: "آپ اِس میں سے جو کچھ پسند فرمائیں، ہم جان و دل سے اُسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو حاضر ہیں۔"

امیر حمزہ نے حیرت سے اس عظیم خزانے کو دیکھا۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے انبار چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک خُوب صورت صندوق کے اندر ایک کوڑا اور ایک ٹوپی رکھی تھی۔ امیر نے آسمان پری سے پوچھا:

"اِس کوڑے اور ٹوپی کا اِس خزانے میں کیا کام؟"

”جناب، یہ کوڑا اور ٹوپی ہمارے بادشاہ اور پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی ہے۔ حضرت سلیمانؑ جب دیوؤں پر خفا ہوتے تو اُنھیں اِسی کوڑے سے مارتے تھے اور جب دیوؤں کو غصّے میں دیکھتے تو یہ ٹوپی پہن کر اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتے تھے۔“

یہ سُن کر امیر حمزہ خوش ہوئے اور دِل میں کہنے لگے کہ اگر یہ ٹوپی اور کوڑا ہاتھ آئے تو خوب ہو۔ کوڑا میرے کام آئے گا اور ٹوپی عُمرو عیّار کو دے دوں گا۔ اُنھوں نے کہا: ”کیا یہ دونوں چیزیں میں لے سکتا ہوں؟“

”حضور، یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ ہم غلاموں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ وزیر سلاسل نے کہا اور وہ صندوق خزانے سے نکال کر امیر حمزہ کے سپرد کر دیا۔

پھر اُس نے ایک سجا سجایا اُڑن کھٹولا منگوایا۔ امیر حمزہ سب کا سلام لیتے ہوئے اُس کھٹولے میں بیٹھے۔ کالے دیو نے کھٹولے کو اپنے سر پر اُٹھایا اور اُڑا۔ چند لمحوں میں تارہ بن گیا۔ امیر حمزہ اُس کی یہ زبردست رفتار دیکھ کر خوش ہوئے

اور کہنے لگے۔ ”اے کالے دیو، ہم تجھے اپنے ملک میں پہنچ کر انعام دیں گے۔“

دوپہر ہوئی تو امیر حمزہ کو نیند نے ستایا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو اُن کا اڑن کھٹولا ایک حسین اور سرسبز سرزمین سے گُزر رہا تھا۔ کالے دیو سے کہنے لگے:

”اے دیو، اُڑن کھٹولے کو جلد نیچے اُتار، ہمیں ایک پُر فضا باغ دکھائی دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر اِس باغ میں آرام کریں۔“

کالا دیو یہ سُن کر حیران ہوا۔ ادب سے بولا:

”جناب یہ علاقہ عفریت کے ظالم بیٹے ہرنا دیو کا ہے۔ آپ یہاں نہ اُتریں ورنہ کِسی آفت میں پھنس جائیں گے۔“

امیر حمزہ نے کالے دیو کا کہنا نہ مانا۔ مجبور ہو کر اُس نے اُڑن کھٹولا ایک باغ میں اُتار دیا۔ امیر حمزہ نے سر پر ٹوپی اُوڑھی اور باغ کی سیر کرنے لگے۔ پھر ایک نہر کے کنارے لیٹ کر بے خبر سو گئے۔ کالا دیو بے حد خوف زدہ تھا۔ وہ

اُڑن کھٹولے کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر امیر حمزہ کی تلاش میں نِکلا مگر اُنہیں کہیں نہ پایا اور پاتا بھی کیسے؟ وہ تو سلیمانی ٹوپی اوڑھے سو رہے تھے۔ مایوس ہو کر کالا دیو وہیں اُڑن کھٹولے کے پاس آیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

اتفاق کی بات کہ وہ باغ ہرنا دیو کے محل کا تھا اور وہ یہاں اکثر سیر کرنے آیا کرتا تھا۔ اُس روز بھی وہ کئی دیوؤں کو لے کر باغ میں آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کالے رنگ کا ایک دیو باغ میں اُڑن کھٹولے کے پاس بیٹھا ہے۔ ہرنا دیو کے آدمیوں نے کالے دیو کو پکڑ لیا اور اُس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور یہ اُڑن کھٹولا کِدھر لیے جاتا ہے؟ پہلے تو دیو نے جھوٹ سچ بول کر اُنہیں ٹالنے کی کوشش کی، مگر ہرنا دیو بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ وُہ سمجھ گیا کہ کالا دیو کچھ چھُپانے کی فکر میں ہے۔ اُس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ کالے دیو کی طبیعت صاف کریں۔ بے چارے دیو نے بڑی مِنّت سماجت کی اور بے حد گِڑگِڑایا مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی اور اُسے اِس قدر پیٹا کہ وہ لہُو لہان ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ مار کے آگے بڑے بڑے بھُوت جی بھاگ جاتے ہیں۔ کالا دیو کہاں تک برداشت کرتا۔ آخر اُس نے سب کچھ اُگل دیا کہ یہ اُڑن کھٹولا عرب کے ایک بہادر نوجوان امیر حمزہ کا ہے۔ اُس نے عفریت دیو کو مار دیا ہے۔ شہرستان زرّیں کی حکومت آسمان پری کو واپس دِلا دی ہے اور اب واپس اپنے وطن جارہا ہے۔

یہ سُن کر ہرنا دیو کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ اپنے باپ کے مارے جانے کی خبر سُن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خُون برسنے لگا اور مُنہ سے جھاگ کے چھینٹے اُڑے۔ اُس نے گرج کر کہا۔ ”وُہ آدم زاد کہاں ہے؟“

”وہ باغ کی سیر کرنے گیا ہے۔“ کالے دیو نے جواب دیا۔

”اُسے فوراً تلاش کر کے ہمارے حضور میں حاضر کیا جائے؟“ ہرنا دیو نے طیش سے کانپتے ہوئے کہا۔ یہ حکم سُنتے ہی اُس کے تمام غلام امیر حمزہ کی تلاش میں نکلے اور باغ کا چپّا چپّا چھان مارا لیکن وہ کہیں نہ دکھائی دیے۔ وہ تو مزے سے سلیمانی ٹوپی اوڑھے نہر کے کنارے سو رہے تھے۔

جب یہ غلام ناکام واپس آئے اور اُنھوں نے ہرنا دیو سے کہا کہ آدم زاد کہیں نہیں ملا تو اُس کے غضب کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تلوار نکالی اور کالے دیو کا سر اُڑا دیا۔ پھر اُڑن کھٹولا توڑا۔ اُس کے بعد اپنے دو زبردست غلاموں کو حکم دیا کہ اُڑن کھٹولے کے پاس کِسی جھاڑی میں چھُپ جائیں اور وہ آدم زاد جونہی اُدھر آئے اُسے گرفتار کر کے میرے محل میں قید کر دیں۔ پھر ہرنا دیو نے اپنے لشکر کو تیّار ہونے کا حکم دیا۔ وہ شہرستان زرّیں پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

ہرنا دیو کے لشکر میں کوئی دو لاکھ خون خوار دیو شامل تھے۔ آندھی اور طوفان کی طرح یہ عظیم لشکر شہرستان زرّیں کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں آسمان پری اور اُس کے ساتھیوں کو خبر بھی نہ تھی کہ کیسی خون ناک بلا اُن کے ملک پر نازل ہونے والی ہے۔ وہاں تو جشن منائے جا رہے تھے۔

یکایک آسمان کا رنگ کالا ہو گیا۔ پھر ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ پریاں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ ہرنا دیو کا لشکر اب شہرستان زرّیں کے اُوپر پرواز کر رہا تھا۔ پھر پریوں نے حملہ آور دیوؤں کو دیکھ لیا، مگر اب بھاگنے کی گنجائش نہ

تھی۔ ہرنا دیو نے خُون کی ندیاں بہا دیں۔ آسمان پری کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا اور شہرستان زرّیں پر قبضہ جما لیا۔

اب امیر حمزہ کا حال سُنیے۔ شام کے وقت اُن کی آنکھ کھُلی تو وہ جلدی جلدی نہر میں مُنہ ہاتھ دھو کر اُڑن کھٹولے کی طرف چلے۔ اُنھوں نے اپنی ٹوپی اس وقت سر سے اُتار دی تھی۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کالے دیو کی گردن تن سے الگ ہو کر دُور پڑی ہے اور اُڑن کھٹولا بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ امیر حمزہ ابھی کچھ فیصلہ کرنے بھی نہ پائے تھے کہ جھاڑیوں میں دُبکے ہوئے دو دیو اُن پر آ پڑے اور اُنھوں نے امیر کو قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن امیر کی خداداد قوّت کے سامنے اُن دیوؤں کی کوئی پیش نہ گئی۔ حمزہ نے ایک ایک کر کے دونوں دیوؤں کو زمین پر دے مارا اور خنجر نکال کر چاہا کہ اُن کی گردنیں الگ کریں کہ وہ دونوں امان امان کہہ کر چلّائے۔ امیر حمزہ نے اُن سے کہا:

"تمھیں اِس شرط پر امان دی جاتی ہے کہ سارا حال سچ سچ کہہ سُناؤ۔"

تب اُن دیوؤں نے سارا قصّہ سُنایا۔ امیر حمزہ بے حد غمگین ہوئے۔ اب وہ جلد سے جلد شہرستان زرّیں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن اُڑن کھٹولا ٹوٹ چکا تھا اور اُسے لے جانے والا کالا دیو بھی مرا پڑا تھا۔ آخر اُنہوں نے اُنہی دیوؤں سے کہا:

"دیکھو، تم مجھے فوراً شہرستان زرّیں لے چلو۔ میں تمہیں بہت سا انعام اکرام دوں گا۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ ابھی تمہاری گردنیں اِس خنجر سے اُڑا دوں گا۔"

امیر حمزہ کا جلال اور اُن کے خنجر کی چمک دیکھ کر دونوں دیوؤں کی سٹّی گُم ہو گئی۔ روتے ہوئے اُن کے قدموں پر گِرے اور کہنے لگے:

"اے آدم زاد تُو ہم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ ہم پر ترس کھا اور ہماری جان بخش دے۔ ہم تجھے ایک آن میں شہرستان زرّیں پہنچا دیتے ہیں مگر ہم شہر میں نہ جائیں گے۔ اگر ہرنا دیو کے کِسی غلام نے ہمیں وہاں دیکھ لیا تو وہ ہمیں ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔"

غرض امیر حمزہ کو دونوں دیو ایک دُوسرے اُڑن کھٹولے پر سوار کرا کے شہرستان زرّیں کی جانب ہوا کی رفتار سے روانہ ہوئے اور دم بھر میں اُنھوں نے اپنے سوار کو شہر کے نزدیک پہنچا دیا۔ تب امیر نے اُنہیں انعام دے کر رُخصت کیا اور خُود وہاں سے پیدل آگے بڑھے۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا دریا نظر آیا جس کا پانی جوش مارتا تھا اور اُس کی لہریں آپس میں جب ٹکراتیں تو نہایت خوفناک آواز پیدا ہوتی۔ اُس دریا کو دیکھ کر امیر کو خُدا کی قدرت یاد آئی۔ دریا کیا تھا، سمندر تھا جس کا دوسرا کنارہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دُور دُور تک کِسی کشتی یا جہاز کے آثار بھی نظر نہ آتے تھے۔ امیر حمزہ سخت پریشان تھے کہ دریا کیوں کر پار کریں۔ آخر جنگل میں جا کر ایک درخت کاٹا اور اُس کے تنے کو کھوکھلا کر کے کشتی بنائی۔ پھر اُس کشتی کو سر پر اُٹھا کر دریا تک لائے اور پانی میں ڈال دیا۔ دریا کا دُوسرا کنارہ آنکھوں سے اوجھل تھا اور معلوم نہیں تھا کہ کتنی دُور ہے۔ اِس لیے امیر حمزہ نے جنگلی پھل، میوے اور میٹھا پانی کشتی میں بھر لیا تھا تاکہ راستے میں کام آئے۔ اُس کے بعد وہ اللہ کا نام لے کر کشتی میں بیٹھے اور اسے لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

کشتی ہوا کے سہارے موجوں سے لڑتی بھِڑتی ایک نا معلوم منزل کی جانب تیزی سے چلی جارہی تھی۔ کئی دِن گُزر گئے۔ سورج نہ جانے کتنی مرتبہ ڈوبا اور کتنی مرتبہ نکلا، مگر دوسرا کنارہ دکھائی نہ دیا۔ آخر ایک دن پھل، میوے اور میٹھے پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ امیر اب بھوکے پیاسے سفر کر رہے تھے اور کشتی کہیں رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

بہت دِن اِسی طرح گزر گئے۔ اُن کا گزارہ اب دریا کے کھاری پانی پر تھا۔ ایک دو بار اُنہوں نے ہمّت کر کے مچھلیاں بھی پکڑیں۔ اُنہیں سورج کی تیز دُھوپ میں بھُونا اور پیٹ کی آگ بجھائی۔

سفر کے چالیسویں روز جب کہ امیر حمزہ کمزوری اور تھکن کے باعث کشتی کے اندر بے ہوش سے پڑے تھے کہ لہروں نے کشتی کو اُچھال کر دوسرے کنارے پر ڈال دیا۔ اُس وقت امیر ہوش میں آئے اور کشتی سے نکل کر کنارے پہ قدم رکھا۔ لیکن قدم رکھتے ہی اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اَن دیکھی طاقت اُنہیں زمین کے اندر گھسیٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُنہوں نے

پوری طاقت لگا کر اپنے آپ کو زمین سے باہر نکالنا چاہا مگر زمین نے اُنہیں اور اپنی طرف کھینچا اور وُہ گھُٹنے گھُٹنے اندر دھنس گئے۔

اصل میں یہاں کی زمین دلدلی تھی اور دلدل میں کوئی آدمی پھنس جائے اور آزاد ہونے کی کوشش کرے تو وہ اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔ امیر حمزہ نے اپنے آپ کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خُدا سے دعا کرنے لگے کہ یا الٰہی میں تیرا خطاکار بندہ ہوں، مُجھ پر کرم فرما اور اِس آفت سے نجات دلا۔

اِدھر تو امیر یہ دُعا کر رہے تھے اور اُدھر آسمان پری کی کئی پریاں اپنی شہزادی کی تلاش میں اُس اندھے کنویں تک جا پہنچیں جس کنویں میں ہرنا دیو نے آسمان پری کو قید کر دیا تھا۔ اُن پریوں کے ساتھ سلاسل وزیر بھی تھا۔ اُس نے تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد آسمان پری کو کنویں سے نکالا اور زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ اُس کے بعد آسمان پری نے وزیر سلاسل سے کہا:

”اپنے علم کے ذریعے معلوم کرو کہ امیر حمزہ اپنے مُلک واپس گے یا نہیں؟“

تب وزیر سلاسل نے علمِ نجوم سے حساب لگایا اور حیران ہو کر بولا:

”اے شہزادی، امیر حمزہ اِس وقت سخت آفت میں ہیں۔ کالا دیو مارا جا چکا ہے اور اُسے ہرنا دیو نے قتل کیا ہے۔ امیر حمزہ شہرستان زرّیں کی جانب واپس آتے ہوئے دریا کے کنارے دلدل میں پھنس گئے اور اگر فوراً اُن کی مدد نہ کی گئی تو یہ خوفناک دلدل اُنہیں نِگل جائے گی۔“

آسمان پری نے اُسی وقت اپنی وفادار پریوں کو حکم دیا کہ فوراً دریا پر جاؤ اور امیر حمزہ کو اُس آفت سے چھڑاؤ۔ پریاں اُڑ کر دریا پر پہنچیں اور امیر حمزہ کو دلدل سے نکالا۔ پھر اُنہیں ہرنا دیو کے حملے کا تمام قصّہ سُنایا۔ حمزہ نے انہیں تسلّی دی اور کہا: ”گھبراؤ مت۔ خُدا نے چاہا تو میں ہرنا دیو کو بھی جہنّم رسید کروں گا۔“

دریا کے پاک صاف پانی میں نہانے کے بعد امیر حمزہ اِن پریوں کی مدد سے شہرستان زرّیں کے اُس مقام پر پہنچے جہاں آسمان پری اور وزیر سلاسل چھُپے ہوئے تھے۔ جُونہی اُنہوں نے امیر حمزہ کی صورت دیکھی، دوڑ کر اُن کے

قدموں پر سر رکھ دیا اور فریاد کرنے لگے۔ امیر نے اُنھیں دلاسا دیا اور کہا: ”ذرا صبر کرو اور تماشا دیکھو کہ میں ہرنا دیو اور اُس کی فوج کا کیا حشر کرتا ہوں۔“

تب وہ اُن سے رخصت ہو کر شہر کے اندر گئے۔ دیکھا کہ کوچہ و بازار اُجڑے ہوئے ہیں۔ دیوؤں نے جگہ جگہ آگ لگا دی تھی۔ پریوں کی بے شمار لاشیں باغوں اور میدانوں میں پڑی تھیں اور ہر طرف کالے کالے اور سُرخ سُرخ دیو گھُوم رہے تھے۔ امیر حمزہ اُس وقت سلیمانی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے اِس لیے کوئی دیو اُنھیں دیکھ نہیں سکا۔ امیر حمزہ پھرتے پھراتے اُس محل کی طرف آ نکلے جس میں آسمان پری رہتی تھی۔

یہاں آکر اُنھوں نے اپنے سر پر سے ٹوپی اُتاری اور ایسا نعرہ مارا کہ زمین کانپ اُٹھی۔ پرنا دیو اُس وقت محل میں پڑا خرّاٹے لیتا تھا۔ نعرے کی آواز سُن کر اُٹھا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر اپنے ایک وزیر سے پوچھنے لگا: ”یہ خوف ناک آواز کیسی تھی؟ کیا کہیں زلزلہ آیا ہے؟“

وزیر ابھی جواب دینے نہ پایا تھا کہ محل کے باہر بے پناہ شور وغُل مچا اور دیو زور زور سے یُوں چیخنے لگے جیسے کسی ناگہانی آفت میں گھِر گئے ہوں۔ تب ہرنا دیو اور اُس کے وزیروں نے محل کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور سخت حیران ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر ہرنا دیو حلق پھاڑ کر چلّایا اور اپنے غلاموں کو حکم دیتے ہوئے کہا:

"اس آدم زار کو فوراً پکڑ کر ہمارے پاس لاؤ۔"

لیکن اتنی ہی دیر میں وہ آدم زاد ہرنا دیو کے کئی ہزار غلاموں اور لشکریوں کو اپنی تلواروں کی مدد سے جہنّم رسید کر چُکا تھا۔

امیر حمزہ دُشمنوں سے لڑتے بھڑتے محل کے اندر گھُس گئے۔ یہاں اُنھوں نے چوبیس مَن وزنی لوہے کا ایک گُرز دیکھا جسے ہرنا دیو کے سوا کوئی اور دیو اُٹھانے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ امیر حمزہ نے اپنی دونوں تلواریں میان میں رکھیں اور گُرز اُٹھا لیا۔ دیوؤں نے جب دیکھا کہ یہ گُرز آدم زاد نے یُوں اُٹھا لیا ہے جیسے معمولی چیز ہے تو وہ سمجھے کہ اِس سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ یہ

آدم زاد قوّت میں ہم سے بہت آگے ہے۔ یہ سوچ کر دیوؤں نے امان طلب کی اور کہنے لگے:

"اے آدم زاد، ہم حضرت سلیمانؑ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تیرے مقابلے میں نہ آئیں گے۔ ہم آج سے تیری غلامی قبول کرتے ہیں۔"

"ہم نے تُم سب کو امان دی۔" امیر حمزہ نے کہا۔ "اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہرنا دیو اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے ہمارے پاس لے آؤ۔"

یہ سُنتے ہی دیوؤں کا ایک گروہ محل میں گھُس گیا اور زبردست جنگ کے بعد ہرنا دیو کو گرفتار کر لیا۔ اُسے امیر حمزہ کے سامنے لائے۔ تب وہ اُن کے قدموں پر گِرا، اپنے قصور کی معافی چاہی، وعدہ کیا کہ آئندہ بغاوت کا خیال بھی دِل میں نہ لائے گا اور آسمان پری کے حکم خوشی خوشی مانے گا۔ یہ وعدہ لے کر امیر حمزہ نے ہرنا دیو اور اُس کے ساتھیوں کو آزاد کیا۔

اُس کے بعد کئی دِن تک امیر حمزہ پریوں کے مہمان رہے۔ آسمان پری نے

سوچا کہ ایسے بہادر نوجوان کا واپس اپنے ملک جانا ٹھیک نہیں۔ اُسے کِسی نہ کسی طرح ہمیں روک لینا چاہیے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ امیر حمزہ سے شادی کر لے گی۔ جِس روز آسمان پری نے یہ ارادہ کیا اُسی روز وُہ امیر حمزہ سے ملنے گئی۔ دیکھا کہ وہ بیٹھے زار زار رو رہے ہیں۔ آسمان پری اُنہیں روتے دیکھ کر حیران ہوئی اور پُوچھنے لگی:

"اے امیر، تُم پر خُدا کی رحمت ہو، روتے کیوں ہو؟ کیا کِسی نے کوئی رنج پہنچایا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے کِسی نے رنج نہیں پہنچایا۔" امیر حمزہ نے جواب دیا۔ "میں تو اپنی قسمت کو روتا ہوں کہ یاروں اور دوستوں سے بچھڑ گیا اور نہ جانے میری غیر حاضری میں شہزادی مِہر نگاہ پر کیا بیت رہی ہو گی۔"

"اے امیر، شہزادی مِہر نگار کون ہے؟" آسمان پری نے پُوچھا۔

"وہ شہنشاہ نوشیرواں کی بیٹی ہے اور بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی مُجھ سے کر

دی ہے۔"

یہ سُن کر آسمان پری کے دِل میں حسد اور غصّے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُسی وقت اپنے دیوؤں کو بُلا کر حکم دیا کہ اِس دم زاد کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دو۔ یہ حکم سُن کر امیر حمزہ حیران ہوئے۔ پھر ہنس کر کہنے لگے:

"اے بے وقوف، معلوم ہوتا ہے تیری شامت آئی ہے۔ کیا تو جانتی ہیں کہ میں اِن دیوؤں کے قابُو میں آنے والا نہیں ہوں بلکہ میں اِن کو حکم دوں تو وہ تجھے ایک آن میں ہلاک کریں۔"

تب آسمان پری کے چہرے کا رنگ لال بھبھوکا ہو گیا۔ اپنی کمر سے بندھا ہوا خنجر کھول کر امیر حمزہ پر جھپٹی اور وار کرنا چاہتی تھی کہ امیر نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی پکڑ لی اور خنجر چھین کر دُور پھینک دیا۔ پھر دیوؤں سے کہا کہ اِسے لے جاؤ اور پر کاٹ کر قلعے کی فصیل سے نیچے گِرا دو۔ دیوؤں کی کیا مجال تھی کہ امیر حمزہ کا حکم نہ مانتے۔ آناً فاناً اُنھوں نے آسمان پری کو پکڑ کر اُس کے پَر کاٹے اور فصیل سے نیچے گرانے کو لے چلے۔ عین اُسی وقت وزیر سلاسل اور

آسمان پری کی بہن عذرا پری وہاں آن پہنچی۔ اُس نے یہ ماجرا دیکھا تو دوڑ کر امیر حمزہ کے پیروں پر گری اور کہا کہ آسمان پری کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ اُس کے پَر کاٹ دیئے گئے۔ اب اُس کی جان بخشی کی جائے۔

امیر نے عذرا پری کی درخواست قبول کی اور دیوؤں کو حکم دیا کہ آسمان پری کو رہا کر دیا جائے۔ پھر اُنہوں نے تختِ شاہی عذرا پری کے حوالے کیا اور خود وہاں سے رخصت ہونے کی تیّاریاں کرنے لگے۔ اُن کے دِل پر اِن پریوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی کا بڑا اثر تھا، اب وہ کسی قیمت پر بھی کوہ قاف میں رہنے کے لیے تیّار نہ تھے۔

عذرا پری نے اُن سے کہا کہ ہم اُڑن کھٹولے کے ذریعے پلک جھپکتے میں آپ کو مُلکِ عرب پہنچا دیے ہیں۔ مگر امیر حمزہ نے اس کی کوئی بات نہ سُنی اور کہا کہ ہمیں تمہارے اُڑن کھٹولے سے زیادہ اپنے خُدا کی مدد اور سہارے پر بھروسا ہے۔ خُدا چاہے گا تو ہمیں کسی نہ کسی طرح اپنے مُلک میں پہنچا دے گا۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے اِن سب کو آہ وزاری کرتے ہوئے چھوڑا اور خود شہرستان

زرّیں سے نکل کر جنگل کی جانب چل دیے۔

اشقر دیو زاد

امیر حمزہ کے نصیب میں ابھی اور پریشانیاں اور مصیبتیں لکھی تھیں اس لیے جنگل میں پھرتے پھراتے راستہ بھُول گئے اور کئی مہینوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے۔ اِس دوران میں تن کے کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے، جنگلی پھل اور پودے کھا کھا کر اور دریا کا پانی پی پی کر صحت بھی بگڑ گئی اور چہرے کا نقشہ بھی ایسا بدلا کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ امیر حمزہ ہیں۔

ایک دن جنگل میں چلے جاتے تھے کہ کسی دیونی کے رونے کی آواز کان میں آئی۔ غور سے سُننے لگے تو حیران ہوئے۔ وہ دیونی روتی جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ "اے میرے پیدا کرنے والے حمزہ کو کہیں سے بھیج تا کہ وہ آئے اور میری مُشکل آسان کرے۔"

تب امیر حمزہ اس دیونی کے قریب گئے۔ دیکھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا صندوق اُس کے آگے رکھا ہے سر پر خاک ڈالتی ہے اور روتی ہے، وہ امیر حمزہ کو دیکھ کر کہنے لگی:

"اے آدم زاد تو کون ہے اور یہاں کِس لیے آیا ہے؟ بہتر یہی ہے کہ اپنی جان سلامت لے کہ بھاگ جا ورنہ کچّا چبا جاؤں گی۔"

امیر حمزہ یہ سُن کر ہنسے اور کہا:

"اے بے وقوف دیونی، تیری کیا طاقت کہ مجھے کچّا چبائے۔ سُن لے کہ میرا نام حمزہ ہے اور ابھی تُو خُدا سے یہ دُعا مانگ رہی تھی کہ حمزہ کو بھیج۔ خُدا نے مُجھے بھیج دیا۔ اب بول کیا چاہتی ہے؟"

دیونی جھَٹ اُن کے قدموں پر گری اور اپنی آنکھیں اُن کے پیروں سے رگڑیں اور کہا:

"اے حمزہ، آفرین ہے تجھ پر کہ کیا موقع سے آیا ہے۔ خُدا کے واسطے میرے

بیٹے کو اِس صندُوق سے نکال۔"

"تیرے بیٹے کو اِس صندُوق میں کِس نے بند کیا ہے؟"

"حضرت سلیمان علیہ السّلام نے قید کیا تھا اور فرما تھا کہ کئی سو سال بعد ملک عرب سے ایک جوان حمزہ نامی آئے گا اور وہ تیرے بیٹے کو اِس صندُوق سے نکال کر نشانی لے گا۔ پس اے امیر، میں اِتنی صدیوں سے تیری راہ تکتی ہوں۔"

دیونی کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو امیر حمزہ نے خُدا کا نام لے کر صندوق کے قُفل کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ لگانا تھا کہ قُفل خود بخود کھُل گیا۔ امیر حمزہ نے صندُوق کا ڈھکنا اُٹھایا۔ دیکھا کہ اُس میں ایک دیو پڑا سوتا ہے۔ اُنہوں نے دیو کو جگایا وُہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا اور کہنے لگا:

"مجھے کِس نے جگایا؟ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ سویا تھا۔"

پھر اُس نے اپنی ماں کو دیکھا اور اُس سے لپٹ گیا۔ دیونی نے اپنے بیٹے کو سارا

قصّہ سُنایا۔ تب وُہ دیو امیر کے قدموں کو چُومنے لگا اور بولا۔ ”آج سے میں آپ کا غلام ہوں۔ جو حکم دیں گے بجالاؤں گا۔“

”مُجھے آدمیوں کی بستی میں پہنچادو۔“ امیر نے کہا۔

”بہُت بہتر۔ آیئے میری گردن پر سوار ہو جایئے۔“ دیو نے ادب سے گردن جھُکا کر کہا۔ ”ابھی چند ساعتوں میں پہنچائے دیتا ہوں۔“

امیر حمزہ اُس کی گردن پر سوار ہوئے۔ دیو وہاں سے آسمان کی جانب اُڑا۔ امیر کو بڑے بڑے مکان کھلونوں کی مانند دکھائی دینے لگے اور درختوں کے جنگل نظر سے غائب ہو گئے۔ دریا ایک پتلی سی چمکتی لکیر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ تب اُس دیو نے امیر حمزہ سے پُوچھا:

”اے امیر، نیچے دیکھو دُنیا کیسی نظر آتی ہے؟“

”ایک خُوب صورت قالین کی طرح۔“ حمزہ نے جواب دیا۔ یہ سُن کر دیو نے اپنی رفتار اور تیز کی۔ اس سے بھی زیادہ اونچائی پر پہنچا، پھر پُوچھا:

"اے امیر، اب دُنیا کیسی نظر آتی ہے؟"

"بالکل گول۔ ایک بڑے پیالے کی طرح۔" حمزہ نے جواب دیا۔

یکایک اُس دیو نے بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا:

"اے آدم زاد بول تجھے سمندر میں پھینکوں یا پہاڑ پر؟"

یہ سُن کر امیر حمزہ حیران رہ گئے۔ دِل میں سوچا کہ یہ دیو بدی پر آمادہ ہے۔ اگر پہاڑ کہوں گا تو سمندر میں پھینکے گا، ممکن ہے پانی میں گِرنے سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نکال دے۔ یہ سوچ کر دلو سے کہنے لگے:

"او مُوذی، میں نے تجھ سے نیکی کی اور تُو اس کا یہ بدلا دینا چاہتا ہے؟"

دیو نے قہقہہ لگایا اور کہا "اے آدم زاد ہمارے ہاں یہی راج ہے۔"

"بہت خُوب، اچھّا تُو مُجھے کِسی پہاڑ پر پھینک دے۔"

"ہاہاہا۔۔۔ میں تجھے پہاڑ پر پھینکنے کے بجائے سمندر میں ڈالوں گا تاکہ مچھلیاں

تیرا گوشت نوچ کر کھائیں۔"

یہ کہتے ہی دیو نے جھٹکے سے امیر حمزہ کو فضا میں پھینک دیا۔ اُنہوں نے خُدا کو یاد کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عین اُسی لمحے حضرت خضر علیہ السّلام فضا میں نمودار ہوئے۔ اُنہوں نے حمزہ کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور نہایت آرام سے سمندر میں اُتار دیا۔

لہروں نے اُنہیں تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر اُچھالا پھر ساحل کی جانب پھینک دیا۔ امیر اس دوران بے ہوش ہو چکے تھے۔ ہوش آیا تو کیا دیکھا کہ سمندر کے ساحل پر ریت میں دھنسے پڑے ہیں۔ آسمان پر سورج چمک رہا ہے اور فضا میں بڑے بڑے بگلے اور دوسرے سمندری پرندے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پرواز کر رہے ہیں۔

اُنہوں نے سمندر سے مچھلیاں پکڑیں، پتھّروں کو رگڑ رگڑ کر آگ جلائی اور مچھلیاں بھُون کر کھائیں۔ اس کے بعد وہاں سے چلے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک بہت بڑا جزیرہ ہے جس میں سر سبز پہاڑ اور خوب صورت جنگل ہیں لیکن

یہاں کوئی جانور یا دیو دکھائی نہ دیا۔ امیر حمزہ بہت دِن تک اِس جزیرے میں رہتے رہے اور تنہائی سے سخت اُکتا گئے۔ چاروں طرف سمندر تھا اور سمندر کو پار کرنے کے لیے کشتی کی نہیں ایک بڑے جہاز کی ضرورت تھی۔

ایک دن جزیرے میں گھومتے ہوئے اُنہوں نے اُسی دیو کو دیکھا جِس نے اُنہیں سمندر میں پھینک دیا تھا۔ اُس دیو کے ساتھ ایک خوبصُورت گھوڑا بھی تھا۔ گھوڑے کو دیکھ کر امیر حمزہ کو بے اختیار اپنا سیاہ قیطاس یاد آیا اور اُن کی آنکھیں اپنے پیارے گھوڑے کی یاد میں آنسوؤں سے تَر ہو گئیں۔

دیو نے امیر حمزہ کو دیکھا تو ڈر کر بھاگا مگر اُنہوں نے اُسے بھاگنے کا موقع ہی نہ دیا۔ خُدا کا نام لے کر زور لگایا اور دیو کو سَر سے اُونچا اُٹھا کر اِس زور سے زمین پر مارا کہ اُس کی کھوپڑی کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ دیو کے مرتے ہی فضا میں ایک پری نمودار ہوئی اور امیر حمزہ کے قریب آ کر کہنے لگی:

"اے آدم زاد، آفرین ہے تیری دلیری پر۔ اِس مُوذی دیو نے مُجھے قید کر رکھا تھا۔ اب اس کے پنجے سے رہائی ملی ہے۔ اِس گھوڑے کا نام اشقر دیو زاد

ہے۔ اِس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ ہُوا میں بھی اُڑ سکتا ہے اور پانی پر بھی دوڑ سکتا ہے۔ اب آپ اِس پر سوار ہوں اور خُدا کی قدرت کا تماشا دیکھیں۔"
یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔ اشقر دیو زار امیر حمزہ کے پاس کھڑا محبّت بھری نظروں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ امیر نے اُس کی گردن سہلائی تو اُس سے دُم ہلائی اور خوشی سے اُچھلنے لگا۔ تب امیر حمزہ اُس کی پیٹھ پر سوار ہوئے۔ اشقر دیو زاد پہلے تو دُور تک دوڑتا چلا گیا پھر آہستہ آہستہ فضا میں اُٹھنے لگا۔ امیر حمزہ نے اُس کی گردن کے لمبے لمبے بال مضبوطی سے پکڑ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اشقر دیو زاد کئی گھنٹے تک اُڑتا رہا۔ حمزہ جب بھی آنکھیں کھول کر نیچے دیکھتے، سمندر نظر آتا۔ وُہ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔

اشقر دیو زاد امیر حمزہ کو اپنی پیٹھ پر بٹھائے کئی دِن تک اُڑتا رہا۔ آخر جب بھُوک پیاس کی وجہ سے بہت نڈھال ہوئے، تب گھوڑا آہستہ آہستہ نیچے اُترا یہاں گُنجان آبادی تھی لیکن لوگ عجیب شکلوں کے تھے۔ اُن کے جسم تو آدمیوں کی طرح تھے مگر کان ہاتھیوں جیسے کے کانوں جیسے تھے اور اُن کے

بادشاہ کو تاج دار کہتے تھے۔ امیر حمزہ اور اُن کے عجیب و غریب گھوڑے کو دیکھ کر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ امیر نے اُنہیں سب حال کہہ سُنایا۔ اتنے میں کسی نے تاجدار بادشاہ کو بھی خبر پہنچا دی۔ وہ خود بڑی شان و شوکت سے آیا۔ عزّت کے ساتھ امیر حمزہ کو اپنے محل میں لے گیا اور خوب خاطر تواضع کی۔

امیر حمزہ کو یہ مُلک اتنا پسند آیا کہ وہ سب کُچھ بھول گئے۔ تاج دار بادشاہ نے اُنہیں اپنی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا۔ پاس پڑوس کی سلطنتوں پر دیو حکومت کرتے تھے اور تاج دار بادشاہ کی ان دیوؤں سے اکثر لڑائیاں ہوا کرتی تھیں، لیکن جب سے امیر حمزہ نے فوجیوں کی کمان سنبھالی کسی دیو کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس طرح بارہ برس گزر گئے۔ آخر کار ایک دن حمزہ کو وطن کی یاد نے بُری طرح ستایا۔ بادشاہ تاج دار سے کہنے لگے: "اے بادشاہ، ہم بہت دن تیرے پاس رہے۔ خُدا کو یہی منظور تھا کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے اتنا عرصہ جدا رہیں۔ مگر اب صبر نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی صورت

نکال کہ ہم جلد اپنے پیارے وطن پہنچ سکیں۔"

یہ سُن کر تاج دار بادشاہ رو پڑا۔ اُسے امیر حمزہ سے محبت ہو گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ امیر حمزہ اُس کے ملک سے جائیں۔ مگر روکنے کی جرأت بھی نہ تھی۔ کیوں کہ اُن کی شہ زوری اور بہادری کا سِکّہ اُس کے دل پر بیٹھ چکا تھا۔ تھوڑی دیر تک آنسو بہانے کے بعد تاج دار نے کہا:

"اے فرزند، تیرا وطن یہاں سے بہت دُور ہے پیدل جانا چاہے گا تو تمام عُمر وہاں نہ پہنچ سکے گا۔ راستے میں سات عظیم الشّان دریا پڑتے ہیں۔ ان سب کو عبور کرنا ضروری ہے۔ پہلا دریا پانی کا، دوسرا آگ کا، تیسرا دھوئیں کا، چوتھا خُون کا، پانچواں پگھلے ہُوئے لوہے کا، چھٹا چاندی کا اور ساتواں سونے کا ہے۔ اِن ساتوں دریاؤں کو خیریت سے پار کر لے تب سمجھ کہ کوہ قاف کی دُنیا سے نکل گیا۔"

تاج دار کی زبانی اِن سات دریاؤں کا ذکر سُن کر حمزہ فکر مند ہوئے۔ تب تاج دار نے کہا:

"اے فرزند، گھبرا مت۔ میں تجھے ایک تدبیر بتاتا ہوں۔ خُدا نے چاہا تو تُو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔ پہلے دریا کے کنارے ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ اُس کی عُمر کا اندازہ ابھی تک کوئی نہیں کر سکا۔ وُہ دن رات خُدا کی عبادت میں لگی رہتی ہے۔ نہ کسی سے کچھ مانگتی ہے اور نہ کہیں آتی جاتی ہے۔ اگر تم اُس بُڑھیا سے جا کر درخواست کرو تو ممکن ہے وہ تمہیں کوہ قاف سے انسانوں کی دنیا میں پہنچا دے۔"

چند دن بعد امیر حمزہ شہر کے لوگوں اور تاج دار بادشاہ سے رُخصت ہو کر اشقر دیو زاد پر سوار ہوئے اور پہلے دریا کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھوڑا کئی رات اور کئی دن لگاتار ہوا میں اُڑنے کے بعد پہلے دریا کے کنارے اُترا۔ حمزہ نے دریا کو دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ دریا کیا سمندر تھا جس کا دوسرا کنارہ دِکھائی نہ دیتا تھا۔ اُنہوں نے پری سے سُنا تھا کہ اشقر دیو زاد پانی میں بھی چل سکتا ہے۔ امیر نے گھوڑے کو دریا میں لے جانے کی کوشش کی مگر وہ بُری طرح اُچھلتا ٹاپتا اور دریا میں کُودنے سے انکار کرتا تھا۔ آخر کار حمزہ نے یہ اِرادہ ترک کر دیا۔

امیر حمزہ بہت دِن تک دریا کے کنارے گھُومتے پھرتے رہے۔ آخر ایک روز ایک خوش نما اور وسیع باغ دِکھائی دیا جس میں نہریں اور فوّارے چل رہتے تھے اور درختوں پر ہزاروں قسم کے حسین پرندے بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ سنگِ مرمر کی ایک عالی شان بارہ دری کے اندر ایک بڑھیا پھونس نظر آئی جو قالین پر بیٹھی خُدا کی عبادت کر رہی تھی۔ امیر حمزہ اُس کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ کئی روز بعد بُڑھیا نے نگاہ اُٹھا کے امیر حمزہ کی طرف دیکھا۔ اُنہوں نے فوراً جھُک کر سلام کیا اور ادب سے کھڑے رہے۔

بُڑھیا کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر امیر حمزہ کی گردن نیچے جھُکائی اور اُن کی پیشانی چوم کر بولی:

"اے بیٹے، میں نہ جانے کب سے تیری راہ تکتی ہوں۔ ہزار برس پہلے خضر علیہ السّلام نے مجھے یہاں بھیجا تھا اور کہا تھا کہ ایک دن اِس حُلیے کا ایک جوان اِدھر آئے گا۔ نام اُس کا حمزہ ہو گا اور میرا فرض یہ ہے کہ حمزہ کو کوہ قاف کے سات دریا پار کرا کے مُلک عرب میں پہنچا دُوں۔ اب میں نے تمہاری شکل

دیکھتے ہی پہچان لیا کہ تم وہی حمزہ ہو۔"

"ہاں بی امّاں، میرا ہی نام حمزہ ہے۔"

یہ سُن کر بُڑھیا بہت خوش ہوئی اور امیر حمزہ کی خاطر تواضع کرنے لگی۔ طرح طرح کے لذیذ پھل اور بھُنا ہوا گوشت خُدا جانے کہاں سے لائی۔ امیر نے مزے مزے سے یہ سب چیزیں کھائیں۔ پھر بُڑھیا نے کہا: "اے بیٹے، اس باغ میں سی مُرغ آیا کرتے ہیں۔ اُن کو مار کر کھال سے اپنا اور اپنے گھوڑے کا لباس تیّار کرو تاکہ آگ کا دریا تم پر کچھ اثر نہ کرے۔"

امیر حمزہ اِسی وقت باغ میں گئے۔ دیکھا کہ ایک جگہ چار بڑے بڑے سی مُرغ بیٹھے ہیں۔ اُن کے قد ہاتھی کے برابر تھے اور جب یہ اپنے پر پھڑ پھڑاتے تو زور کی آندھی آتی اور درختوں کی شاخیں جھُولنے لگتیں۔ امیر حمزہ نے اِن میں سے ایک سی مرغ کو مارا۔ باقی تین اُڑ گئے۔

ایک ماہ کی محنت کے بعد اُنہوں نے سی مُرغ کی کھال سے اپنا اور اپنے

گھوڑے کا لباس بنایا۔ یہ لباس ایسا تھا کہ آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصّہ دِکھائی نہ دیتا تھا۔ اِس کام سے فُرصت پائی تو وہ نیک دل بُڑھیا ہاتھ میں ایک لمبا عصا لے کر اُن کے آگے آگے چلی، دریا کے کنارے پر آئی اور اپنا عصا پانی پہ مارا۔ اُسی وقت پانی دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ تب اُس بڑھیا نے امیر سے کہا:

''بیٹے بے فکر ہو کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور آنکھیں بند رکھو۔''

حمزہ نے ایسا ہی کیا۔ سات دن اور سات راتیں برابر چلتے رہے، آخر آٹھویں روز دریا سے پار ہوئے۔ جب پہلا دریا عبور کر لیا تو بُڑھیا نے اپنا عصا اُنہیں دیا اور کہا کہ ہم اب اِس دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ جب ہم مَر جائیں تو اس دریا کے کنارے قبر کھود کر ہمیں دفنا دینا۔ اِس کے بعد بے دھڑک تُم ہر دریا میں کُود جانا۔ ہمارا یہ عصا جب تک تمہارے پاس رہے گا، خُدا نے چاہا تو کوئی پریشانی قریب نہ پھٹکے گی۔

یہ کہتے ہی اُس بُڑھیا کا دَم نکل گیا اور وہ بے جان ہو کر زمین پر ِگر پڑی۔ امیر

حمزہ کو اُس کے مرنے کا بے حد رنج ہُوا۔ بے اختیار رونے لگے۔ قبر کھود کر اُسے دفن کیا۔ پھر اُس کا عصا سنبھالا اور اشقر دیوزاد کی لگام تھام کر آگے روانہ ہوئے۔

امیر حمزہ کو یہاں چھوڑ کر اب ہم آپ کو عُمرو عیّار اور اُس کے دوستوں کے پاس لیے چلتے ہیں تا کہ معلوم کریں کہ جب حمزہ کوہ قاف کو روانہ ہوتے تو عُمرو اور اُس کے ساتھیوں پر کیا بیتی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ خواجہ بزُرجمہر نے عُمرو عیّار کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ خُدا امیر حمزہ کو کوہ قاف میں اٹھارہ سال تک رکھے گا اور یہ مدّت پوری ہونے کے بعد حمزہ شہر تنجہ میں تم سے آن کر ملے گا اس لیے ضروری ہے کہ تم اپنے دوستوں اور شہزادی مِہر نگار سمیت شہر تنجہ کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ جب حمزہ کو پریاں اُڑن کھٹولے پر بٹھا کر لے اُڑیں تو اُن کے دوست ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر خوب روئے۔ آخر عُمرو نے سب کو تسلّی دی اور سفر کی تیّاریاں شروع کیں۔ ایک شُبھ گھڑی میں مکّے سے نکلے اور مغرب کی جانب روانہ ہوئے۔ ژوپین مکّار

کے لشکر نے اُن کا پیچھا کیا۔ کئی مرتبہ خُون ریز لڑائیاں ہوئیں جن میں ژوپین کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ آخر اُس نے عُمرو کی فوج کا پیچھا چھوڑ دیا اور مدائن کی جانب لوٹ گیا۔

عُمرو اور لِندھور منزلوں پر منزلیں طے کرتے ایک عظیم الشّان شہر کے نزدیک پہنچے جس کے چاروں طرف نہایت عالی شان پتھّر کا قلعہ بنا ہوا تھا اور فصیلیں اِس قلعے کی اتنی اچھی تھی کہ سر اُٹھا کر دیکھو تو ٹوپی نیچے جا گرے۔ عُمرو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور کہا کہ یہ قلعہ فتح کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ سُن کر عُمرو طیش میں آیا اور کہنے لگا:

”بہت اچھّا، میں خود جاتا ہوں اور قلعہ فتح کر کے دکھاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ایک گوشے میں گیا اور جادو کے زور سے اپنی صورت وزیر بختک کی سی بنائی۔ پھر سو بہادُر سواروں کا ایک دستہ لے کر قلعے کے دروازے پر پہنچا اور دربانوں سے کہا:

”فوراً قلعہ دار کو خبر کرو کہ نوشیر واں کا وزیر بختک آیا ہے اور شہزادی مِہر نگار کو حمزہ کے ہاتھ سے چھین لایا ہے۔ اب حمزہ کے لشکری پیچھا کر رہے ہیں، اس لیے جلد دروازہ کھولو تا کہ شہزادی مِہر نگار کو قلعے میں لے آئیں۔“

دربان دوڑے دوڑے گئے اور قلعہ دار کو ساری بات سُنائی وُہ اِسی وقت فصیل پر آیا۔ دیکھا کہ واقعی نوشیر واں کا وزیر بختک موجود ہے۔ اُس نے پہرے دار سے کہا کہ دروازہ کھول دو۔ عُمرو عیّار اپنے فوجی دستے کو لے کی بڑی شان و شوکت سے قلعے میں داخل ہو گیا۔ قلعے دار نے پوچھا:

”جناب شہزادی مِہر نگار کہاں ہے؟“

”ابھی اُنہیں بُلواتا ہوں۔“ عُمرو نے جواب دیا پھر اپنے ایک سوار کو خفیہ پیغام دے کر لِندھور کے پاس بھیجا کہ قلعے کا دروازہ کھلا پڑا ہے فوراً آؤ اور قبضہ کر لو۔

لِندھور اور دوسرے پہلوان آندھی طوفان کی طرح آئے اور آناً فاناً قلعے پر

اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ اِس قلعے میں تین سال تک کی خوراک جمع تھی۔ عُمرو عیّار کا لشکر تین برس تک اِس قلعے میں رہا۔ پھر یہاں سے نکلا اور مغرب کی طرف چلا۔ بہت عرصے بعد شہر حلب میں پہنچا۔ مُقبِل وفادار کے چچازاد بھائی ناظر حلبی اور عادل حلبی کچھ فاصلے پہ رہتے تھے۔ وہ فوراً استقبال کو آئے اور شہر حلب کے چاروں طرف گہری خندق کھدوا کر پانی سے بھر دی تاکہ کوئی دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ پھر وہ نہایت عزّت اور احترام کے ساتھ مُقبِل وفادار، لندھور اور عُمرو وغیرہ کو شہر میں لے گئے اور کہا کہ یہاں چار سال کی خوراک جمع ہے۔ جب تک یہ ذخیرہ ختم نہ ہو جائے ہم تمہیں کہیں اور نہ جانے دیں گے۔

غرض اِسی طرح مُلکوں مُلکوں اور شہروں شہروں سفر کرتے ہوئے سترہ سال کی مدّت میں وہ شہر تنجہ میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک سال کا غلّہ جمع تھا اور جب ایک سال بعد یہ غلّہ ختم ہُوا تو فوجی سپاہیوں نے بھُوک اور فاقے سے بے تاب ہو کر گھوڑوں کو ذبح کر کے کھانا شروع کر دیا۔ عُمرو نے سب لوگوں

کے راشن میں کمی کر دیا۔ یہ دیکھ کر عادی کرب پہلوان کو سخت غصّہ آیا۔ لیکن عُمرو سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ پیٹ کی آگ کو کیوں کر بجھائے کہ اچانک ایک تدبیر دماغ میں آئی۔ دوڑا دوڑا عُمرو کے پاس آیا اور کہنے لگا:

”بھائی عُمرو! دیکھتے ہو بھُوک کے مارے میری کیا حالت ہوئی ہے۔ ہڈیاں، پسلیاں سب باہر نکل آئی ہیں۔ چاہو تو ایک ایک کر کے سب گِن لو۔ اگر چند روز یہی حال رہا تو میں بھائی حمزہ کو دیکھے بغیر ہی مَر جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر جھوٹ مُوٹ آنسو بہانے لگا۔ عُمرو عیّار بھی اُس کی یہ حالت دیکھ کر افسوس کرنے لگا اور بولا:

”بھائی عادی، جہاں اتنے دن صبر کیا ہے، چند روز اور کرو۔ اٹھارہ سال کی مدّت پوری ہونے میں ایک آدھ دِن ہی باقی رہ گیا ہے۔ خُدا نے چاہا تو حمزہ سے ملاقات ہو گی۔ وہی ہماری یہ مشکل آسان کریں گے۔“

"یہ بات تو ٹھیک ہے عُمرو بھائی۔ لیکن مُجھ سے بھُوک برداشت نہ ہو گی۔ اجازت دو کہ کِسی اور شہر کی طرف جاؤں اور وہاں سے کھانے کا کچھ سامان لاؤں۔" اُس نے ایسی ضد کی کہ عُمرو کو مجبوراً اجازت دینی پڑی۔ اُس نے عادی سے کہا۔ "دیکھو جلدی واپس آنا اور زیادہ دیر نہ لگانا۔"

عادی کرب اپنے ہاتھی پر سوار ہوا اور جنگل کی راہ لی۔ رات ہوئی تو اُسے جنگل میں کچھ فاصلے پر مشعلیں جلتی ہوئی دکھائی دیں۔ جلدی سے وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ تاجروں کا ایک بہت بڑا قافلہ ٹھہرا ہوا ہے۔ تاجروں نے جب اِس انسانی دیو کو دیکھا تو بے حد ڈرے اور نہایت احترام سے ایک خوب صورت خیمے میں لے گئے۔ عادی نے قافلے کے سالار کو طلب کیا اور کہنے لگا:

"باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے ہمارے کھانے کا کُچھ انتظام کرو۔"

"ابھی لیجئے جناب۔ سب کچھ حاضر ہُوا جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد عادی کرب کے آگے بھُنے ہوئے دنبوں، پھلوں اور دُودھ کی

بڑی بڑی بالٹیوں کا انبار لگا ہُوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے سب چیزیں ہڑپ کیں۔ پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولا:

"ناشتا اچھا تھا۔ اب دو گھنٹے بعد ہم باقاعدہ کھانا کھائیں گے۔"

یہ سُن کر قافلے والوں کے ہوش اُڑ گئے۔ دِل میں کہنے لگے کہ یہ ضرور کوئی جن ہے ورنہ اتنا کھا لینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اُنھوں نے ہاتھ باندھ کر کہا:

"جناب ہمارے پاس جو کچھ تھا حاضر کر دیا۔ اب معافی چاہتے ہیں۔"

اتنی بات سُنی تو عادی طیش میں آیا۔ قافلے کے اندر گھُوم پھِر کر پندرہ بیس بکریاں پکڑیں، جنگل سے گھاس پھُونس لا کر آگ جلائی۔ پھر ان بکریوں کو ذبح کر کے آگ پر بھُونا اور نمک لگا کر کھا گیا۔ پھر توند پر ہاتھ پھیرتا اور خوف ناک ڈکاریں لیتا ہُوا ایک چشمے پر پہنچا اور اُس میں مُنہ ڈال کر سارا پانی پی گیا۔ اُس کے بعد واپس قافلے میں آیا۔ ہاتھی کی پیٹھ سے اپنا بستر اُتارا اور بچھا کر سو

گیا۔ قافلے والے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اور اُنہیں پُورا یقین ہو چُکا تھا کہ اِنسان کے بھیس میں یہ ضرور کوئی بلا ہے جو اُنہیں چَٹ کرنے آئی ہے۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ جب یہ بلا گہری نیند سو جائے، تب چُپکے چُپکے اپنا سامان باندھو اور بھاگ نِکلو۔

آدھی رات ہوئی تو عادی کے بھیانک خرّاٹوں سے جنگل کی فضا گونج رہی تھی۔ قافلے والے رُخصت ہونے کی تیّاریاں کر رہے تھے کہ اچانک ڈاکوؤں کا ایک گروہ اُدھر سے گزرا۔ ڈاکوؤں نے جنگل میں مشعلیں جلتی دیکھیں تو خُوش ہوئے کہ زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ ایک قافلہ جنگل میں ہی مِل گیا۔ آؤ اُس کو لوٹیں۔ وہ سب کے سب تلواریں اور خنجر چمکاتے ہوئے قافلے پر آن پڑے۔ قافلے والوں کی چیخ پکار اور غُل غپاڑے سے عادی پہلوان کی آنکھ کھُل گئی۔ دِل میں کہنے لگا خُدا اِنہیں غارت کرے۔ تھوڑی دیر کو آنکھ جھپکی تھی کہ جگا دیا۔ یکایک اُسے احساس ہُوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ اِتنے میں قافلے کا سردار عادی کے پاس آیا اور کہنے لگا:

”جناب، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ اِس وقت آپ کی مدد درکار ہے۔ آپ ہی اِن سے دو دو ہاتھ کر سکتے ہیں۔“

”فکر نہ کرو۔ میں ابھی اِن بدمعاشوں کی مرمّت کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر عادی پہلوان نے اُٹھ کر زبردست نعرہ لگایا۔ اُس کی آواز کی گرج سے ڈاکوؤں کے کلیجے اُچھل کر حلق میں آ گئے اور اُن کے گھوڑے سہم کر ٹاپنے لگے۔ تب عادی نے ڈاکوؤں کو اُٹھا اُٹھا کر زمین پر پٹخنا شروع کیا اور سب کی خُوب مرمّت کی۔ اس کے بعد اُن سے قافلے والوں کا لُوٹا ہُوا مال واپس لیا اور آئندہ کے لیے وعدہ لیا کہ کبھی ڈاکہ نہ ماریں گے اور محنت مزدوری کر کے روزی کمائیں گے۔

عادی پہلوان کے یہ کمالات دیکھ کر قافلے والوں کو اپنی بدگمانی پر بڑا افسوس ہُوا، وہ سب کے سب ہاتھ جوڑتے ہوئے عادی کے پاس گئے اور کہنے لگے:

”حضُور، آپ بڑے بہادر ہیں۔ ہم آپ کے بارے میں یہ سوچ رہے تھے کہ

انسان کے بھیس میں کوئی خبیث بلا ہے جو ہمیں ہڑپ کرنے آئی ہے، مگر اب پتا چل گیا ہے کہ آپ واقعی ہم ہی جیسے آدمی ہیں۔ خُدا کے واسطے ہمارا قصور معاف کر دیجئے۔"

یہ بات سُن کر عادی خوب ہنسا۔ پھر جواب میں کہا: "تمہارا قصور صرف اُسی صورت میں معاف ہو سکتا ہے کہ مجھے آیندہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونی چاہیے۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں جناب، آیندہ ایسا نہ ہو گا۔" قافلے والوں نے کہا۔

دِن نِکلا تو قافلے والے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ عادی پہلوان بھی اُن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شام ہوئی تو ایک عالی شان شہر کے آثار دکھائی دیے۔ تاجروں کا قافلہ شہر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ہر طرف شورِ ماتم برپا ہے۔ عورتوں اور مَردوں نے کالے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ عادی نے ایک آدمی سے پُوچھا:

”کیوں بھائی، تُم پر کیا آفت آئی کہ کالے کپڑے پہن کر یُوں روتے پیٹتے پھر رہے ہو؟“

اُس شخص نے عادی کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا پھر مُنہ بنا کر بولا: ”معلوم ہوتا ہے تم اِس شہر میں اجنبی ہو۔ ارے بھائی، آج ہمارا بادشاہ دنیا سے رُخصت ہوا ہے اور رعایا اُسی کا سوگ منا رہی ہے۔“

”یہ تو تُم نے بہت افسوس ناک خبر سنائی“ عادی نے کہا۔ ”اِس کا مطلب یہ ہے کہ شہر کے تمام بازار بند پڑے ہوں گے۔ اب میں کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے حاصل کروں گا؟“

یہ سُن کر وُہ شخص سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا: ”اگر تُم ہمارے شہر میں اجنبی کی حیثیت سے نہ آتے تو میں اِسی تلوار سے تمہاری گردن اُڑا دیتا۔ بے وقوف ہاتھی کے بچّے، ہمارا تو بادشاہ مَر گیا ہے اور تجھے کھانے پینے کی سوجھ رہی ہے۔“

عادی پہلوان کو غصّہ تو بہت آیا۔ جی چاہا کہ اس شخص کا ٹیٹوا دبائے، مگر یہ سوچ کر غصّہ ضبط کیا کہ نئے شہر میں ہنگامہ کرنا ٹھیک نہیں، یہ بے چارے تو پہلے ہی اپنی مُصیبت میں گرفتار ہیں۔ قافلے والوں سے جُدا ہو کر وہ شہر کی سیر کرنے کے لیے ایک طرف چل پڑا۔ ایک خوب صورت اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے محل کے قریب پہنچا تو لذیذ کھانوں کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی۔ عادی کا رُواں رُواں خوشی سے کانپنے لگا۔ فوراً اُدھر کا رُخ کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بہت سے باورچی ایک جگہ جمع ہیں اور ہزاروں دیگیں پکا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ وزیرِ اعظم کا محل ہے اور یہ دیگیں بھی وزیرِ اعظم ہی پکوا رہا ہے تاکہ غریبوں اور مسکینوں میں کھانا تقسیم کیا جائے۔ تب عادی نے پوچھا کہ وزیرِ اعظم صاحب اس وقت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ ایک باورچی نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں اور تھوڑی دیر تک واپس آئیں گے۔

یہ سُن کر عادی وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور للچائی ہوئی نظروں سے دیگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بار بار باورچیوں سے پوچھنا شروع کیا کہ یارو

کھانا پکنے میں کِتنی دیر ہے؟ شروع شروع میں تو باورچی اُسے جواب دیتے رہے مگر جب اُس نے پُوچھ پُوچھ کر اُن کا ناطقہ بند کر دیا تو سب باورچی مل کر اُس کے پاس آئے اور کہنے لگے:

”تو کون ہے؟ چل بھاگ یہاں سے۔ یہ کھانا تیرے لیے نہیں پک رہا ہے اور نہ ہم تیرے نوکر چاکر ہیں جو تیری ہر فضول بات کا جواب دیتے رہیں۔“

اب تو عادی کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ باورچیوں کو پکڑ پکڑ کر ہوا میں اُچھالنے لگا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے بے شمار لوگ جمع ہو گئے اور ہر طرف غُل مچ گیا کہ ایک دیو شہر میں آیا ہے اور وزیرِ اعظم کے باورچیوں کو گیند کی طرح فضا میں اُچھال رہا ہے۔ کِسی شخص نے یہ خبر وزیرِ اعظم کو بھی پہنچا دی۔ وہ فوراً لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے محل کی طرف آیا۔ دیکھا کہ سات فُٹ اُونچا دیو جیسا شخص باورچیوں کی گردن ناپ رہا ہے اور اُن سے چوہے بلّی کا کھیل کھیلنے میں مصروف ہے۔

عادی نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ وزیرِ اعظم آن پہنچا۔ باورچیوں کو پرے

پھینک کر وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا ”کیا آپ کے شہر میں مہمانوں سے یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کا بادشاہ مَر گیا ہے تو اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ لوگ مُجھے کھانے کو کُچھ نہیں دیتے۔ مجبوراً یہ حرکت کرنی پڑی۔“

وزیرِ اعظم نے دیکھ لیا تھا کہ آدمی بے ڈھب ہے اور اگر اِس سے گرمی سردی کی گئی تو معاملہ اور خراب ہو گا۔ یہ سوچ کر اُس نے نرم لہجے میں کہا:

”مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ جیسے عزّت دار مہمان سے اِن جاہل باورچیوں نے ایسا بُرا سلوک کیا بہر حال میں سب کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ آیئے آپ میرے ساتھ محل میں چلیے اور جتنا کھانا چاہیں نوش فرمایئے۔“

”ہاں، یہ بات آپ نے لاکھ روپے کی کہی۔“ عادی نے خُوش ہو کر کہا۔

وزیرِ اعظم نے عادی پہلوان کی ایسی خاطر تواضع کی کہ اُسے بالکل ہی اپنا مُرید کر لیا۔ بھلا کھانے پینے کی بے شمار چیزوں کے سامنے عادی کو عُمرو یا لِندھور کی یاد کیسے آتی۔ کئی دِن اِسی طرح گزر گئے۔ آٹھویں روز وزیرِ اعظم نے عادی کو

اپنے پاس بلایا اور کہا:

"جناب پہلوان صاحب، آج ہم مُلک کا نیا بادشاہ چنیں گے۔ اِس لیے میں آپ کی خاطر تواضع نہیں کر سکوں گا۔ آپ کے جہاں سینگ سمائیں، جا سکتے ہیں۔"

یہ سُن کر عادی پہلوان سخت پریشان ہُوا۔ دِل میں سوچنے لگا یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب میں کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ اِن کے پاس اتنی بڑی فوج ہے کہ میں اکیلا زیادہ دیر تک لڑ بھی نہیں سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ چُپ چاپ یہاں سے کھِسک جاؤں اور کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کروں۔ اُس نے وزیرِ اعظم سے کہا۔ "بُہت بہتر جناب، بندہ رخصت ہوتا ہے۔ مگر اِتنی مہربانی کریں کہ راستے میں کھانے پینے کا کُچھ سامان عنایت فرما دیں۔ پچاس بکریاں، ایک سو مُرغ، دو تین ہزار انڈے، ایک من شہد، پچاس من دودھ اور دو تین سو پھل وغیرہ۔"

"اچھّا، ہم یہ انتظام بھی کر دیں گے۔ مگر پہلے بادشاہ کا انتخاب ضُروری ہے۔"

"یہ اِنتخاب کِس طرح کرتے ہیں؟" عادی نے پُوچھا۔

"اِس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ایک پرندہ ہوا میں چھوڑتے ہیں جسے ہُما کہتے ہیں۔ شہر کے سب آدمی ایک وسیع میدان میں پہلے سے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ پرندہ تھوڑی دیر تک ہوا میں اُڑنے کے بعد کِسی ایک شخص کے سر پر خود بخود بیٹھ جاتا ہے۔ ہم اُس شخص کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔"

"خواہ وہ شخص کوئی موچی ہو یا بھکاری یا لوہار یا بڑھئی؟" عادی نے کہا۔

"بے شک۔ ہمیں اِس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کون ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہُما کِس کے سر پر بیٹھتا ہے۔"

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ آپ کا پرندہ۔۔۔ کیا نام۔۔۔۔ ہُما میرے سر پر بیٹھ جائے تو آپ مُجھے بادشاہ بنا لیں گئے۔"

"ضرور۔ ہماری رسم یہی ہے۔" وزیرِ اعظم نے جواب دیا۔

یہ سُن کر عادی کی کھوپڑی میں پھر کھُد بُد شروع ہوئی۔ دِل میں کہنے لگا، کیا مزہ

ہو اگر میں بادشاہ بن جاؤں۔ آخر قسمت آزما لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ وُہ وزیرِ اعظم سے کہنے لگا:

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ کیا خبر وہ پرندہ میرے ہی سر پر بیٹھ جائے۔“

یہ سُن کر وزیرِ اعظم کا کیا کلیجا خُوف سے بیٹھ گیا۔

سخت پریشان ہوا کہ اِس موذی کو یہ بات کیوں بتادی۔ اُس کا دِل کہہ رہا تھا کہ ہُما اِس کے سر پر ضُرور بیٹھ جائے گا، کیوں کہ یہ قد میں سب آدمیوں سے اُونچا ہے۔ وزیرِ اعظم دِل میں تو عادی کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا مگر ظاہری طور پر اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا:

”پہلوان صاحب، یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہوگئی کہ ہُما آپ کے مبارک سر پر بیٹھے اور آپ ہمارے بادشاہ بن جائیں۔“

قِصّہ مُختصر عادی پہلوان اُس وسیع و عریض میدان میں پہنچا جہاں لاکھوں آدمی

جمع تھے اور ہر شخص اِسی اُمید میں تھا کہ ہُما اُسی کے سر پر بیٹھے گا۔ عادی پہلوان مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آیا تو لوگوں نے اُس کا راستہ چھوڑ دیا اور حیرت سے دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بارہ ہٹّے کٹّے حبشی غلام میدان میں نمودار ہوئے اور اُنھوں نے بڑے بڑے بگل بجا کر اعلان کیا کہ ہُما چھوڑا جاتا ہے اس لیے سب لوگ خاموش ہو جائیں۔ اِس اعلان کے ساتھ ہی چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا اور ہر شخص سانس روک کر ہُما کے اُڑنے کا اِنتظار کرنے لگا۔

تب وزیرِ اعظم نے سونے کے بنے ہوئے خوبصُورت پنجرے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرندے کر باہر نکالا اور ہوا میں اُڑا دیا۔ یہ پرندہ ہوا میں جدھر جِدھر اُڑتا، اُدھر اُدھر لاکھوں آدمیوں کی نگاہیں اُس کا پیچھا کرتیں۔ دیر تک بہت اُونچائی پر اُڑنے کت بعد ہُما آہستہ آہستہ چکّر کاٹتا ہُوا نیچے اُترنے لگا پھر یکا یک وہ عادی پہلوان کے سر پر جا بیٹھا۔

اُسی وقت وزیرِ اعظم نے گھُٹنوں کے بل جھُک کر عادی پہلوان کو سلام کیا اور مبارک باد دی۔ پھر تالیوں اور نعروں کے شور میں ایک جلوس بنایا گیا اور

عادی پہلوان رعیّت کی سلامی لیتا ہُوا وزیرِ اعظم کے ساتھ شاہی محل میں داخل ہوا۔ وُہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اِس رات سارے شہر میں چراغاں کیا گیا اور نئے بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کا جشن دھوم دھام سے منایا گیا۔

عادی کو حکومت کرتے ہوئے بہت دن گُزر گئے۔ اِس مُدّت میں وہ اپنے دوستوں اور بھائیوں سب کو بھُول بھال گیا۔ حکومت کا کام وزیر اور امیر کرتے اور عادی کو دن رات سوائے پیٹ بھرنے کے کوئی کام نہ تھا۔

ایک دن ایسا اتّفاق ہوا کہ وزیرِ اعظم کی لڑکی جِس کا نام مہتاب تھا، شاہی محل میں آئی, عادی نے اُسے دیکھا تو دِل میں کہنے لگا ایسی خوب صُورت لڑکی آج تک نظر سے نہیں گُزری۔ اگر اِس سے شادی ہو جائے تو کیا کہنے ہیں۔ اُسی وقت وزیرِ اعظم کو بُلا کر حکم دِیا:

"ما بدولت تمہاری صاحب زادی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ آرزو پوری کی جائے۔"

"جہاں پناہ، غُلام کے لیے حضور کی یہ آرزو فخر کا باعث ہے۔" وزیرِ اعظم نے ادب سے کہا۔ "لیکن اِس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے جِسے ماننا ضُروری ہے۔"

"وہ شرط کیا ہے؟ جلد بیان کرو۔" عادی نے گرج کر کہا۔

"حضور شرط یہ ہے کہ اگر میری لڑکی وفات پا جائے تو آپ کو بھی اُس کے ساتھ ہی قبر میں زندہ دفن ہونا پڑے گا۔" وزیرِ اعظم نے جواب دیا۔

"کیا بکتے ہو؟" عادی نے گھبرا کر کہا۔ "بھلا یہ کیسے مُمکن ہے؟"

"جہاں پناہ، ہمارے مُلک کا رواج یہی ہے کہ اگر شوہر کی زندگی میں بیوی مَر جائے تو شوہر کو بیوی کی قبر میں زندہ دفن ہونا پڑتا ہے۔ اور اگر شوہر مَر جائے تو بیوی شوہر کے ساتھ زندہ دفن ہو گی۔ اِس شرط کو قبُول کرنا ضروری ہے ورنہ آپ کی شادی نہ ہو سکے گی۔"

عادی پہلوان سمجھا کہ وزیرِ اعظم مذاق کرتا ہے اُس نے قہقہہ لگاتے ہُوئے

کہا:

”مابدولت کو تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ جلد شادی کا بندوبست کیا جائے۔“

اور یُوں عادی پہلوان نے وزیر زادی مہتاب سے شادی کرلی۔

دِن آہستہ آہستہ گُزرنے لگے۔ عادی کو ہر وقت کھانے پینے اور خرّاٹے لینے کے سوا کوئی کام تھا۔ مزے سے زندگی کے دِن گزار رہا تھا کہ ایک روز محل میں کنیزوں کے رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ عادی نے پہرے داروں کو بھیجا کہ خبر لائیں کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ پہرے دار تھوڑی دیر بعد سینہ پیٹتے اور سروں پر خاک ڈالتے حاضر ہوئے اور رورو کر کہنے لگے:

”جہاں پناہ، غضب ہو گیا۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔ملکۂ عالیہ مہتاب انتقال فرما گئیں۔“

یہ سُن کر عادی پہلوان کو اپنے پیروں تلے کی زمین سِرکتی محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ تخت سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُٹھا نہ

گیا۔ معلُوم ہوا جیسے بدن میں سے ساری جان نِکل گئی۔ آخر بڑی مُشکل سے غلاموں اور وزیروں نے اُٹھایا۔ محل کے اندر لے گئے اور پلنگ پر لِٹا دیا۔

ملکہ مہتاب کا جنازہ اُٹھا تو لاکھوں لوگ اس کے ساتھ تھے۔ بادشاہ سلامت عادی پہلوان بھی روتے دھوتے اور سینہ پیٹتے چلے جا رہے تھے۔ قبرستان پہنچے تو دیکھا کہ ایک گہرا گڑھا کھُدا ہوا ہے۔ عادی نے وزیرِ اعظم کے کان میں کہا:

"ملکہ کے لیے اتنی بڑی اور گہری قبر کھدوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جہاں پناہ شاید آپ بھول گئے کہ شادی سے پہلے آپ نے کیا شرط مانی تھی۔" وزیرِ اعظم نے کہا۔

"کون سی شرط؟ ہمیں بالکل یاد نہیں۔" عادی نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ شرط یہ تھی جہاں پناہ کہ اگر شوہر کی زندگی میں بیوی مَر جائے تو شوہر کو بیوی کے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہونا پڑے گا، اِسی لیے یہ قبر اتنی لمبی، چوڑی اور گہری کھُدوائی گئی ہے۔ آپ اس میں بڑے آرام سے دفن ہو سکیں گے

کہ زیادہ تکلیف نہ ہو گی۔"

وزیرِ اعظم کی یہ باتیں سُن کر عادی کے تلووں میں آگ گئی اور کھوپڑی تک پہنچی۔ طیش میں آ کر چلّایا:

"او بد بخت، یہ کیا بکواس ہے۔ ہم تمہارے بادشاہ ہیں اور بادشاہوں سے ایسا بے ہودہ مذاق ٹھیک نہیں ہے۔"

"جہاں پناہ، اِس غلام کو آپ سے مذاق کرنے کی ہرگز جرأت نہیں ہو سکتی۔" وزیرِ اعظم نے ادب سے گردن جھکا کر کہا "میں نے تو آپ کو اِس مُلک کی رسم اور حضور کا وعدہ یاد دلایا ہے۔"

"اجی جہنّم میں جاؤ تم اور تمہارے یہ رسم و رواج۔" عادی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "لو اور سُنو، مُجھے اِس قبر میں مُردہ عورت کے ساتھ دفن کرنے چلے ہیں۔ کیا خُوب۔ اِس مذاق کے لیے میں ہی دنیا میں رہ گیا ہوں۔ خبر دار آیندہ مُجھ سے ایسی بے ہودہ بات کِسی نے کی تو وہ خود نتیجے کا ذمّہ دار ہو گا۔"

وزیرِ اعظم نے حبشی غلاموں کے گروہ کو اشارہ کیا۔ وہ سب کے سب لوہے کی زنجیریں ہاتھوں میں تھام کر آہستہ آہستہ عادی پہلوان کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر عادی سخت گھبرایا۔ بے اختیار لوگوں کی طرف مُنہ کر کے چلّانے لگا:

"اے لوگو، یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں تمہارا بادشاہ ہوں اور تُم دیکھ رہے ہو کہ وزیرِ اعظم میری توہین کر رہا ہے۔ اسے روکو، ورنہ میں شاہی جلّادوں کو حکم دے دوں گا کہ وہ وزیرِ اعظم کی گردن تن سے جُدا کر دیں۔"

عادی کی باتیں سُن کر لوگوں نے قہقہے لگائے اور کہا:

"بادشاہ سلامت یہ چیخ پُکار اور غُل غپاڑا بالکل بے کار ہے۔ آپ کو اِس مُلک کی رسم اور اپنے وعدے کے مطابق اپنی بیوی کے ساتھ قبر میں دفن ہونا ہی پڑے گا۔ اگر آپ خود ہی قبر میں کُود جائیں تو زیادہ بہتر ہے ورنہ ہم سب آپ کو پکڑ کر گڑھے میں دھکیل دیں گے۔"

اب تو عادی پہلوان کے ہوش گُم ہُوئے، پسینے چھُوٹ گئے۔ چاروں طرف

بے بسی سے دیکھا۔ ہر طرف ہزاروں حبشی غلام اور طاقت ور سپاہی ہاتھوں میں تلواریں اور نیزے لیے چوکس کھڑے تھے اور کِسی جانب سے بھاگنے کے لیے راستہ ملنے کی اُمّید نہ تھی۔ عادی نے دِل ہی دِل میں دُعا کی کہ "یاالٰہی میں کِن موذیوں میں آن پھنسا۔ ایک مرتبہ اِن کے پنجے سے رہائی دے دے۔ پھر میرے باپ دادا کی توبہ ہے جو اِدھر کا رُخ بھی کروں۔"

عادی ابھی یہ دُعا مانگ ہی رہا تھا کہ چار پانچ سو حبشی غلام اُس پر ایک دم اَن پڑے اور اِس پہلے کہ عادی اُن میں سے ایک آدھ کو ہلاک کرے، اُنہوں نے اُسے لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں جکڑ لیا اور گڑھے کی طرف لے چلے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عادی کی دُعا خُدا نے سُن لی، کیوں کہ عین اُسی لمحے ایک گھُڑ سوار اُدھر آ نِکلا۔ وُہ اِس شان و شوکت سے آ رہا تھا کہ سب کی نظریں بے اختیار اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔

آنے والے نے عادی کی چیخیں سُنیں تو سیدھا اُدھر آیا اور لوگوں سے پوچھا کہ

اِس شخص کو زنجیروں میں کیوں جکڑ رکھا ہے؟ لوگوں نے اُسے سارا قصّہ سُنایا۔ آنے والے نے ایک نظر عادی کو دیکھا، پھر زور سے قہقہہ لگایا اور کہا:

"اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں اِس سے دو باتیں کرلوں۔"

"ہاں ہاں، ضرور کیجیے۔" وزیرِ اعظم نے کہا اور غلاموں کو اشارہ کیا کہ عادی کو اِدھر لے آئیں۔ عادی ہانپتا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اجنبی گھڑ سوار کو دیکھتا ہوا قریب آیا۔ سوار نے اُس سے کہا:

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ تُم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تمہاری بیوی مَر گئی تو تُم اُس کے ساتھ ہی زندہ دفن ہو جاؤ گے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"جنابِ عالی، یہ بکواس کرتے ہیں۔ جھُوٹ بولتے ہیں۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔" عادی نے گِڑ گڑا کر کہا "خُدا کے لیے مُجھے اِن وحشیوں کے پنجے سے آزاد کرائیے۔ ساری زندگی آپ کے بال بچّوں کو دعائیں دوں گا۔"

"اگر تم سچ سچ بتاؤ گے کہ کیا وعدہ کیا تھا تو میں تمہاری سفارش کروں گا۔"

اجنبی نے کہا۔

عادی گردن جھکائے چند لمحے تک سوچتا رہا۔ پھر رُک رُک کر کہا:

”ہاں، میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میری بیوی مَر گئی تو اُس کے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہو جاؤں گا۔“

یہ سُن کر اجنبی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا:

”بندۂ خُدا، مرد کی شان یہ ہے کہ ایک مرتبہ زبان سے جو اقرار کرے، اُسے پورا کرتا ہے۔ اگر تم نے وزیرِ اعظم سے وعدہ کیا تھا تو اب مُکرتے کیوں ہو؟“

اجنبی کی یہ بات سُن کے عادی پہلوان کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر خوشامدانہ لہجے میں بولا:

”بھائی جان، تُم مُجھے کوئی شریف اور بہادر آدمی نظر آتے ہو۔ میں بھی گیا گُزرا شخص نہیں۔ امیر حمزہ کے سے نامی گرامی پہلوان کا دودھ شریک بھائی ہوں۔“

"آہا۔۔۔ اب معلوم ہوا کہ میں نے تمھیں پہلے کہاں دیکھا تھا۔" اجنبی نے ہنس کر کہا "تمہارا نام شاید عادی کرب ہے۔"

"بے شک، بے شک۔ آپ نے صحیح پہچانا۔" عادی خوش ہو کر بولا: "خُدا کے واسطے اِن وحشیوں کو سمجھایئے کہ میرے ساتھ یہ بے ہودہ سلوک نہ کریں۔ اگر امیر حمزہ اور اُن کے دوستوں کو اِس کرتوت کا پتا چل گیا تو وہ اِس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور کِسی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

"خُوب، بہت خوب۔ مگر یہ بتاؤ عادی پہلوان کہ تُم امیر حمزہ کے دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر یہاں کیسے چلے آئے اور بادشاہ کیوں کر بن بیٹھے؟"

"جناب یہاں آنا پڑا۔ مُجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب کان پکڑتا ہوں۔ یہ دراصل مجھے دوستوں سے بے وفائی کرنے کی سزا ملی ہے۔"

"امیر حمزہ کے دوست آج کل کہاں ہیں؟" اجنبی نے پُوچھا۔

"وہ شہر تنجہ میں ہیں۔ حکیم بزرجمہر نے کہا تھا کہ حمزہ اٹھارہ برس کوہ قاف میں

رہنے کے بعد تُم لوگوں سے شہر تنجہ میں آن کر ملیں گے، اِس لیے عُمرو، لِندھور، سلطان بخت مغربی، استفتانوش وغیرہ سب وہیں ہیں اور شہزادی مِہر نگار اُن کے ساتھ ہے۔ مگر تم یہ باتیں کیوں پوچھتے ہو؟"

اجنبی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر وُہ کوئی جواب دیے بغیر اپنے گھوڑے سے اُتر کر عادی کے قریب گیا اور لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں یُوں توڑ دیں جیسے وہ کچّے سُوت کی بنی ہوئی ہوں؟

عادی پہلوان کو یُوں آزاد ہوتے دیکھ کر لوگوں ہیں بھگدڑ مچ گئی۔ وزیرِ اعظم کے اشارے سے حبشی غُلام تلواریں سُونت سُونت کر عادی کی جانب لپکے مگر اجنبی نے فوراً اپنی تلوار نکالی اور بلند آواز سے کہا۔ "خبر دار، اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یہیں خُون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ سُن لو کہ میرا نام حمزہ ہے۔ جو شخص میرے مقابلے میں آئے گا، جان سلامت نہ لے جائے گا۔"

امیر حمزہ کا یہ نعرہ سُن کر جو جہاں تھا وہیں رُک گیا اور اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ

بہت سے حبشی غلام اور سپاہی اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عادی نے جونہی امیر حمزہ کو پہچانا، دوڑ کر اُن کے قدموں کو بوسہ دیا اور بے اختیار رونے لگا۔ حمزہ نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا:

"اگر اِس وقت خُدا مُجھے یہاں نہ بھیجتا تو تُم ہزاروں مَن مٹّی کے نیچے دبے پڑے ہوتے۔"

اتنے میں وزیرِ اعظم اور سلطنت کے دُوسرے تمام امیر وزیر امیر حمزہ کے قریب آئے اور جھُک جھُک کر سلام کرنے لگے۔ پھر اُنہیں نہایت عزّت کے ساتھ شہر میں لے گئے اور خوب خاطر تواضع کی۔ تین دن بعد امیر حمزہ اور عادی پہلوان وہاں سے رُخصت ہو کر شہرت تنجہ کی جانب روانہ ہوئے۔

دمشق کا بادشاہ

راستے میں امیر حمزہ نے عادی پہلوان کو کوہ قاف میں اٹھارہ سال کاٹنے اور طرح طرح کی مُصیبتیں جھیلنے کی داستان سُنائی۔ عادی کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی پڑتی تھیں اور وہ دِل میں سوچ رہا تھا کہ اِس ساری داستان میں دیوؤں اور پریوں کا ذکر تو ہے مگر کھانے پینے کی کِسی چیز کا نام ونشان تک نہیں ہے۔

چلتے چلتے یہ دونوں مسافر ایک گہری جھیل کے قریب پہنچے۔ امیر حمزہ تُو سستانے کے لیے گھنے درختوں کی چھاؤں میں جا بیٹھے اور عادی پانی پینے کے لیے جھیل پر پہنچا۔ ابھی پانی میں مُنہ ڈالنے بھی نہ پایا تھا کہ جھیل میں کچھ فاصلے پر لکڑی کا ایک بڑا صندوق تیرتے دیکھا۔ عادی فوراً جھیل میں کُودا،

تیرتا ہوا اس صندوق تک گیا اور اُسے گھسیٹ کر کنارے پر لایا۔ اُس کا خیال تھا کہ صندوق میں بیش بہا خزانہ بند ہے لیکن جوں ہی ڈھکنا کھولا، اُس کے اندر سے دھواں سا نکلا۔ پھر اُس دھویں نے ایک خوفناک دیو کی شکل اختیار کر لی۔

عادی پہلوان کی خُوف سے گھگھّی بندھ گئی۔ بھاگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دیو نے دونوں ہاتھوں سے عادی کا ٹینٹوا دبایا۔ تکلیف کے مارے عادی کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ وُہ سمجھ گیا کہ یہ دیو نہیں مُوت کا فرشتہ ہے۔

اچانک زمین پھٹی اور اُس میں سے سو سال سے زیادہ عُمر کے ایک بڑے میاں برآمد ہوئے۔ اُن کی کمر جھک کر کمان بن گئی تھی اور سفید لمبی داڑھی کے بال زمین کو چھُو رہے تھے۔ اُن بڑے میاں نے نزدیک آکر دیو سے کہا:

"اے دیوزاد، اِس آدمی نے کیا خطا کی ہے کہ تو اِسے مارنے کے درپے ہے؟"

"بڑے میاں، اِس نے میرے آرام میں خلل ڈالا اور مُجھے صندوق سے باہر

نکالا۔"

بڑے میاں نے حیرت سے اُس دیو اور پھر صندوق کو دیکھا اور کہنے لگے:

"عقل نہیں مانتی کہ تم جیسا دیو اِس چھوٹے سے صندوق میں سما سکتا ہے۔"

دیو نے قہقہہ لگا کر کہا "اگر تمہارا خیال ہے کہ میں جھُوٹ بول رہا ہوں تو لو دیکھو۔"

یہ کہہ کر وہ دیو پھر دھواں بنا اور صندوق میں داخل ہو گیا۔ بڑے میاں نے جلدی سے صندوق کا ڈھکنا بند کر دیا۔ عادی پہلوان اب بھی اُسی طرح چِت زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ دیو دوبارہ صندوق میں بند ہو گیا تو جان میں جان آئی۔ بڑے میاں کے پیروں پر گِرا اور کہنے لگا:

"حضرت، آپ اِس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ورنہ یہ مُوذی تو میری گردن ناپ چکا تھا۔ خُدا کے لیے بتایئے کہ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام خضر ہے اور خُدا کے حکم سے مُصیبت زدوں کی مدد کو پہنچا ہوں۔ تم

امیر حمزہ کے دوست اور دُودھ شریک بھائی ہو اور خُدا امیر حمزہ سے ابھی بہت کام لینا چاہتا ہے، اِس لیے اُس نے مُجھے تمھاری مدد کو بھیجا ہے۔"

یہ کہتے ہی زمین دوبارہ شق ہوئی اور خواجہ خضر اُس میں سما گئے۔ عادی نے وہ صندوق سر اُٹھایا اور ہانپتا کانپتا امیر حمزہ کے پاس پہنچا، سارا قصّہ سُنایا اور کہا:

"بھائی حمزہ، دِل چاہے تو تم بھی اِس دیو کی زیارت کر لو۔ مُجھے تو موت کا مزہ آ گیا۔ اگر خواجہ تھوڑی سی دیر اور لگاتے تو بندے کی لاش جھیل کے کنارے پھڑک رہی ہوتی۔"

"اِس صندوق کو یُونہی بند رہنے دو اور اپنے شہر تنجہ لے چلو۔ وہیں جا کر اطمینان سے اِس کی زیارت کریں گے۔" امیر حمزہ نے ہنس کر کہا۔

یہ سُن کر عادی پہلوان کا مُنہ لٹک گیا اور اُس نے پھر کُچھ نہ کہا۔ دراصل یہ صندوق اتنا بھاری تھا کہ اُسے سر پر اُٹھاتے ہوئے عادی کو اپنی گردن ٹوٹنے کا خطرہ تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ امیر حمزہ صندُوق کھول کے دیو کو آزاد کریں

تا کہ وہ اُن کی گردن ناپے اور یہ اُسے جہنّم رسید کریں مگر عادی کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد امیر حمزہ جب آگے چلنے کے لیے تیّار ہوئے تو عادی پہلوان نے مُنہ بسورتے ہوئے وہ صندُوق سر پر اُٹھایا اور امیر حمزہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اُدھر شہر تنجہ میں عُمرو عیّار اور اُس کے یار دوست اور شہزادی مِہر نگار ایک ایک دِن اُنگلیوں پر گنتے تھے اور حساب لگائے تھے کہ کب اٹھارہ سال پورے ہوں اور امیر حمزہ یہاں نمودار ہوں۔ عادی پہلوان جس روز سے گیا تھا اُس کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔

البتہ عُمرو نے اپنے آئینۂ سکندری میں دیکھ کر معلوم کر لیا تھا کہ وہ کسی شہر کا بادشاہ بن گیا ہے اور دِن رات کھانے پینے کے دھندوں میں مصروف ہے۔ عُمرو نے اپنے طلسمی آئینے میں یہ تو پتا کر لیا تھا کہ عادی کِس شہر میں ہے۔ لیکن وُہ شہر کِدھر اور کتنی دُور ہے؟ یہ بات اُسے معلوم نہ تھی۔

جس روز اٹھارہواں سال ختم ہُوا، اُس سے اگلے روز شہزادی مِہر نگار شہر تنجہ

کے قلعے کی چھت پر چڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں تیر کمان تھی۔ یکایک دو راج ہنس فضا میں اُڑتے ہوئے اُدھر سے گزرے۔ شادی مِہر نگار نے اپنے آپ سے شرط لگائی کہ اگر ایک ہی تیر سے یہ دونوں راج ہنس شکار ہو کر زمین پر گِرے تو میں سمجھوں گی کہ بزُرجمہر کا کہنا درست نکلے گا اور امیر حمزہ آج ضرور مُجھ سے آن ملیں گے اور اگر نشانہ خطا گیا تو سمجھوں گی کہ بزُرجمہر کا حساب غلط ہے۔

یہ سوچ کر شہزادی نے کمان میں تیر چڑھایا اور پُورے زور سے چِلّہ کاٹ کر چھُوڑ دیا۔ تیر ہوا مَیں سنسناتا ہوا گیا اور برابر اُڑتے ہوئے دونوں راج ہنسوں کو پروتا ہُوا زمین کی طرف گرنے لگا۔

اپنا نشانہ کام یاب ہوتے دیکھ کر شہزادی مِہر نگار خُوشی سے ناچنے لگی۔ فوراً عُمرو عیّار کو طلب کر کے یہ دلچسپ قصّہ سُنایا اور کہا:

”بھائی عُمرو فوراً باہر جاؤ اور میرے شکار کے ہوئے راج ہنسوں کو اُٹھا کر لاؤ۔“

عُمرو خوشی خوشی قلعے سے باہر نِکلا اور راج ہنسوں کی تلاش میں چلا۔

اُدھر امیر شہر تنجہ کے خاصے قریب آ چُکے تھے اور قلعہ اُنہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عادی پہلوان بھاری صندوق اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور امیر حمزہ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یکایک آسمان پر سے دو خُوب صورت پرندے نیچے گِرے۔ امیر حمزہ نے دیکھا کہ دونوں ایک ہی تیر کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ حیران ہوئے اور دِل میں سوچنے لگے کہ کوئی بہت ماہر اور نشانچی شکاری ہے جِس نے ایک وقت میں دو اُڑتے ہوئے پرندوں کو ایک ہی تیر سے شکار کیا ہے۔ اُنہوں نے یہ پرندے اُٹھا کر ذبح کیے اور تیر کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

عین اُسی لمحے عُمرو عیّار وہاں آن پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک شخص جس کے چہرے پر گھنی سیاہ ڈاڑھی اور خُوب صورت نوکیلی مُونچھیں ہیں، راج ہنسوں کو ذبح کر کے اپنے تھیلے میں ڈال رہا ہے۔ عُمرو نے للکار کر کہا:

”یہ پرندے ہم نے شکار کیے ہیں۔ خیریت چاہتا ہے تو اُنہیں فوراً میرے حوالے کر دے، ورنہ اتنا پیٹوں گا کہ سب کھایا پیا بھول جائے گا۔“

اٹھارہ برس تک کوہ قاف کی انوکھی دُنیا میں رہنے کی وجہ سے امیر حمزہ کے حُلیے اور شکل صُورت میں اِتنا فرق آ گیا تھا کہ عُمرو عیّار اُنہیں پہچان نہ سکا۔ عادی پہلوان کو جب قبر میں زندہ دفن کیا جا رہا تھا اور امیر موقعے پر پہنچے تھے تب عادی اُس وقت تک پہچان نہ پایا تھا جب تک امیر حمزہ نے خود اپنا نام پتا نہ بتایا۔ اب پھر عُمرو کو اپنے سامنے دیکھ کر امیر حمزہ خوش ہوئے مگر دِل لگی کے لیے کہنے لگے:

”مجھے تو تُم اُچکّے دکھائی دیتے ہو۔ کبھی آئینہ بھی دیکھا ہے؟ شکل چڑی ماروں جیسی ہے اور چلے ہو دوسروں پر تُہمت دھرنے۔“

”میں کہتا ہوں فوراً دونوں پرندے میرے حوالے کر، ورنہ تیرے حق میں اچھّا نہ ہو گا۔ سب بدزبانی دھری رہ جائے گی۔ شہزادی مِہر نگار کا شکار اور تُو یُوں ہماری آنکھوں کے سامنے اُڑا لے جائے۔“

”یہ شہزادی مِہر نگار کون ہے؟“ امیر حمزہ نے پُوچھا۔

”ہمارے پیارے دوست حمزہ کی بیوی اور شہنشاہ نوشیر واں کی بیٹی۔“ عُمرو نے اکڑ کر جواب دیا۔

”آہا! اب سمجھا۔۔۔ حمزہ وُہی پہلوان تو نہیں جو آج کل کوہ قاف میں ہے۔“

”ہاں ہاں، وہی امیر حمزہ ہیں۔ مگر بھائی تمہیں کیوں کر پتا چلا؟“ عُمرو نے حیرت سے کہا۔

یہ سُن کر حمزہ نے قہقہہ لگایا اور کہا ”میری اُن کی مُلاقات کوہ قاف میں ہوئی تھی وہ تو وہاں عذرا پری سے شادی کر چکے اور وہیں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مُجھ سے اُنہوں نے یہی بات کہی تھی اور فرمایا تھا کہ اگر کبھی میرے دوستوں عُمرو، مُقبِل لِندھور وغیرہ سے ملاقات ہو تو یہ پیغام دے دینا کہ مُجھے بھُول جائیں۔ میں اب کوہ قاف ہی میں رہوں گا۔“

اُن کے مُنہ سے یہ کلمے سُن کر عُمرو عیّار پتھّر کا بُت بن گیا۔ اِتنے میں دُور سے

عادی پہلوان سر پر صندُوق اُٹھائے آتا دکھائی دیا۔ عُمرو دوڑتا ہوا اُس کی طرف گیا اور پکار کر کہا:

"عادی بھائی تم کہاں غارت ہو گئے تھے۔ اب اِتنے عرصے بعد شکل دکھائی دی ہے اور وُہ بھی اِس بھیس میں۔ وہ بادشاہت کہاں گئی؟"

عادی پہلوان نے عُمرو کو دیکھ کر صندُوق سر سے اُتار کر نیچے رکھا، پھر شرمندہ ہو کر کہا۔ "مُجھے معاف کر دو۔ یُوں سمجھو کہ میری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ وہ تو خُدا نے بڑی خیر کی کہ عین وقت پر بھائی حمزہ پہنچ گئے، ورنہ ظالموں نے مُجھے زندہ دفن کر ہی دیا تھا۔"

"بھائی حمزہ پہنچ گئے؟ کہاں پہنچ گئے؟ کِدھر ہیں وُہ؟" عُمرو چلّایا۔

"معلوم ہوتا ہے میری طرح تُم بھی اُنہیں پہچان نہیں سکے۔" عادی نے قہقہہ لگایا۔ "ارے یار تمہارے سامنے ہی تو کھڑے ہیں؟"

تب عُمرو سمجھا۔ دوڑتا ہوا امیر حمزہ کے پاس گیا اور اُن سے چمٹ کر رونے لگا۔

امیر حمزہ کے بھی آنسو نکل آئے۔ دونوں دوست جب ایک دوسرے سے گلے مل ملا کر اور رو دھو کر فارغ ہوئے تو عادی پہلوان نے عُمرو عیّار سے کہا۔

"عُمرو بھائی بہت افسوس کی بات ہے کہ تُم نے ہمیں اِس قابل بھی نہ سمجھا کہ ہمارے گلے سے لپٹ کر دو آنسو بہا لیتے۔"

"میں بے وفا لوگوں سے گلے مِل کر رویا نہیں کرتا۔" عُمرو نے جواب دیا۔

امیر حمزہ اِس جواب پر کھِلکھِلا کر ہنس پڑے۔ اِسی طرح باتیں کرتے، دِل بہلاتے یہ تینوں دوست شہر تنجہ کے قلعے میں داخل ہوئے۔ امیر حمزہ کو تو کسی نے نہ پہچانا، البتّہ عادی پہلوان کو دیکھ کر سب خوش ہوئے اور سپاہیوں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے۔

قلعے کے محل میں شہزادی مِہر نگار عُمرو کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے کانوں میں اِن نعروں کی آواز پہنچی تو خُوش خُوش اُٹھی اور ایک کنیز سے پُوچھنے لگی "سپاہی نعرے کیوں لگا رہے ہیں؟ کہیں امیر حمزہ واپس تو نہیں آ گئے۔"

”نہیں ملکۂ عالم۔ امیر حمزہ نہیں آئے بلکہ وہ مُوا گوشت کا پہاڑ عادی پہلوان واپس آیا ہے اور سپاہی اُس کے زندہ سلامت آجانے کی خوشی میں نعرے لگا رہے ہیں۔“

یہ سُن کر مِہر نگار کا چہرہ غم سے بُجھ کر رہ گیا پھر اُس نے محل کی ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سب سے آگے عُمرو عیّار چلّا آرہا تھا۔ اُس کے پیچھے گھنی ڈاڑھی اور مُونچھوں والا ایک شخص گھوڑے پر سوار تھا اور اُس سوار کے پیچھے عادی پہلوان کئی من وزنی لکڑی کا صندوق سر پر اُٹھائے چل رہا تھا۔

عُمرو دونوں شِکار کیے ہوئے راج ہنس لے کر شہزادی کے پاس آیا اور کہنے لگا:

”یہ لیجئے شہزادی صاحبہ، اپنا شکار سنبھالیے اور حمزہ کی فکر چھوڑیے۔ ابھی ابھی کوہ قاف کی دنیا سے ایک شخص آیا ہے اور حمزہ کا یہ پیغام لایا ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے، اور اُنھوں نے کوہ قاف کی ملکہ عذرا پری سے شادی کر لی ہے۔“

عُمرو کی یہ باتیں سُن کر مِہر نگار پر سکتہ طاری ہو گیا۔ دماغ چکرانے لگا لیکن پھر خیال آیا کہ عُمرو کی عادت ہی مذاق کرنے کی ہے۔ وہ سنبھل کر بولی:

”مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔ کوہ قاف سے آنے والے شخص سے کہو کہ وہ خود یہاں آن کر حمزہ کا پیغام سُنائے۔“

اب تو عُمرو کی سٹّی گُم ہوئی۔ کمرے کے باہر ایک پردے کے پیچھے امیر حمزہ چھپے ہُوئے ساری گُفتگو سُن رہے تھے۔ عُمرو نے اُن سے جا کر کہا:

”غضب ہو گیا۔ شہزادی مِہر نگار کہتی ہے کہ پیغام لانے والے کو میرے پاس لاؤ اب آپ چلیے۔ دیکھیں وُہ آپ کو پہچانتی ہے یا نہیں۔“

تب امیر حمزہ خود شہزادی کے قریب گئے اور ادب سے سلام کیا۔ مگر شہزادی اُنہیں دیکھتے ہی خوشی سے چیخ ماری اور روتی ہوئی قدموں پر آن گری۔

امیر حمزہ کی آمد پر شہر تنجہ میں زبردست جشن منایا گیا۔ کئی دن تک چراغاں ہوا اور آتش بازی چھوڑی گئی۔ یکایک ایک قاصد نے آن کر خبر دی کہ

نوشیر واں اور ژوپین کا لشکر یہاں سے بھاگ کر دمشق کی جانب چلا گیا ہے اور دمشق کے حاکم کا مہمان ہُوا ہے۔ اُس کا نام ہوم دمشقی تھا اور قُوّت کا یہ حال کہ میدان میں چالیس من وزنی سونے کی اینٹ رکھ کر اُس پر کھڑا ہو جاتا اور چار سو قوی ہیکل پہلوان مِل کر زور کرتے لیکن ہوم دمشقی ٹس سے مس نہ ہوتا لیکن جب وہ اپنا پاؤں ہلاتا تو سب کے سب پہلوان قلابازیاں کھاتے ہوئے دُور جا گرتے۔

دمشق کے قریب پہنچ کر نوشیر واں نے شہر سے باہر ڈیرے ڈال دیے اور بختک وزیر سے کہا کہ تُو جا کر ہوم دمشقی کو ہماری آمد کی خبر کر، تا کہ وہ ہمارے استقبال کو آئے۔ بختک نامراد ہوم کے دربار میں گیا۔ جاتے ہی اُس کے سامنے سجدے میں گر پڑا اور اپنی ناک عاجزی سے زمین پر رگڑنے لگا۔ بختک کی یہ حرکت دیکھ کر ہوم ہنسا اور کہنے لگا:

”جس بادشاہ کے ایسے ذلیل اور خوشامدی وزیر ہوں وہ کیوں نہ ذلیل و خوار ہو۔“

پھر اُس نے بختک کو حکم دیا کہ آدمیوں کی طرح سیدھا کھڑا ہو اور اپنے آنے کی غرض بیان کر۔"

بختک نے ابتدا سے اِنتہا تک سارا قصّہ نوشیرواں کی پریشانیوں کا عرض کیا۔ تب ہوم نے کہا کہ تُو جا اور نوشیرواں کو میرے پاس لے آ۔ اگر حمزہ ادھر کا رُخ کرے گا تو ایسی سزا دوں گا کہ قیامت تک لوگ یاد رکھیں گے۔ بختک نے سلام کیا اور خوشی خوشی نوشیرواں کے پاس واپس آیا اور کہنے لگا:

"چلیے حضُور۔" یہ سُن کر نوشیرواں کا خُون کھول اُٹھا۔ گرج کر کہنے لگا: "او بد ذات تو نے ہمارے رُتبے کو یہاں تک گرایا کہ اب ہم خُود ہوم کے طلب کرنے پر اُس کے پاس حاضر ہوں گے؟ وہ خُود کیوں نہیں آیا۔ ضرور تیری شرارت ہے۔"

یہ کہہ کر جلّاد کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اِس بد بخت کا سر تن سے جدا کرو۔ جلّاد نے کلہاڑا سنبھالا اور بختک کی طرف بڑھا، مگر بزُرجمہر ہاتھ باندھ کر نوشیرواں کے سامنے آیا اور کہا:

”حضور یہ شخص نادان اور جاہل ہے اور جاہل کو مارنا بادشاہ کی شان کے شایان نہیں۔ آپ اِسے معاف کر دیں اور مُجھے اجازت دیں کہ میں ہوم دمشقی کے پاس جاؤں اور اُسے حضور کا اِستقبال کرنے کے لیے آمادہ کروں۔“

بزُرجمہر کی سفارش پر نوشیرواں نے بختک کا قصُور معاف کیا اور بزُرجمہر کو اجازت دی کہ وہ ہوم کے پاس جائے۔ تب بزُرجمہر نے اپنے پانچ سو حبشی غلاموں کو اپنے ساتھ لیا، ایک ہزار سفید ہاتھی سجائے اور نہایت شان و شوکت سے ہوم کے دربار میں گیا۔ ہوم پر بزُرجمہر کا ایسا رُعب پڑا کہ بے اختیار تعظیم کو اُٹھا اور سلام کر کے اُن کے ہاتھ چُومے، اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور کہا:

”جناب نے کیسے تکلیف فرمائی؟ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بیان فرمایئے؟“

خواجہ بزُرجمہر نے رُعب سے کہا۔ ”اے بادشاہ شہنشاہ نوشیرواں تیرے علاقے میں آئے اور تُو اُس کا استقبال تک نہ کرے۔ نہایت رنج اور افسوس کا

مقام ہے۔ فوراً نوشیر واں کی خدمت میں حاضری دے اور عزّت و احترام کے ساتھ یہاں لا۔"

یہ سُن کے ہوم بے حد شرمندہ ہوا۔ اُسی وقت لاؤ لشکر کے ساتھ شہر کے باہر گیا اور نوشیر واں کے قدم چُوم کر کہا:

"حضُور، یہ غُلام گُستاخی کی معافی چاہتا ہے۔ آپ عادل شہنشاہ ہیں۔ اُمّید ہے میری کوتاہی معاف فرمائیں گے۔ آپ بے خوف ہو کر میرے محل میں قیام کیجیے۔ اگر وہ عرب جِس کا نام امیر حمزہ ہے، اِدھر آیا تو اُس کے دونوں کان اُکھاڑ ڈالوں گا۔"

نوشیر واں خوش ہُوا لیکن خواہ بزُرجمہر ہوم دمشق کی اِس بڑھک پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

چالیس دِن تک مکمّل آرام کرنے کے بعد امیر حمزہ نے اپنے دوستوں اور پہلوانوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ نوشیر واں آج کل کہاں ہے؟ کسی سے

جواب نہ بن پڑا۔ آخر عُمرو عیّار نے کہا:

"میں نے آئینۂ سکندری میں دیکھ کر معلوم کیا ہے کہ نوشیرواں اِن دِنوں دمشق کے بادشاہ ہوم کے محل میں ہے اور ہوم نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر حمزہ اِدھر آیا تو اُس کے کان جڑ سے اُکھاڑ ڈالوں گا۔"

عُمرو کے مُنہ سے یہ جملہ سُن کر امیر حمزہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگے:

"دوستو، خُدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر ہوم نے میرے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے تو انشاء اللہ میں اُسی کے کان اکھاڑوں گا۔"

یہ کہہ کر اُسی وقت اپنی فرج کو تیّاری کا حکم دیا اور راتوں رات منزلیں طے کرتے ہوئے دمشق کی فصیل کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ ہوم دمشقی نے فوراً شہر پناہ کے دروازے بند کرا دیئے اور خندق میں پانی چھُڑوا دیا۔ اِس کے بعد اُس نے حمزہ کے پاس اپنا ایک قاصد یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "خیر چاہتے ہو تو

جہاں سے آئے ہو وہیں ٹھنڈے ٹھنڈے لوٹ جاؤ ورنہ ایسی عِبرت ناک سزا دُوں گا کہ لوگ قیامت تک ڈرا کریں گے۔"

تب امیر حمزہ نے قاصد سے کہا کہ تُو یہاں سے چلا جا، ہم اپنے آدمی کے ہاتھ تھوڑی دیر میں اِس پیغام کا جواب دیتے ہیں۔ پھر اُنہوں نے مقبل وفادار سے کہا کہ قلم دوات لاؤ اور ایک خط ہوم دمشقی کے نام لکھو۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"اے بد بخت شخص، تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں امیر حمزہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ظالموں کو سزا دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہوں میں نے بڑے بڑے زور آور اور قوّی ہیکل پہلوانوں کے سر نیچے کیے ہیں اور اُن کی پُشتیں زمین سے لگائی ہیں۔ میں اٹھارہ برس کوہ قاف کی انوکھی دُنیا میں رہ کر آیا ہوں وہاں میں نے ہزاروں خبیث دیوؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ اُن کے آگے تیری کیا ہستی ہے۔ اپنا بھلا چاہتا ہے تو میرے قدموں پر آ کر گر جا اور دُشمنوں کو میرے حوالے کر دے ورنہ قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ

تجھے جیتا نہ چھوڑوں گا اور تیرے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر گدھے کا ہل پھراؤں گا۔"

مُقبِل وفادار نے جب یہ لکھ لیا تو امیر حمزہ نے عُمرو عیّار کو طلب کر کے خط دیا۔ پھر وہ ٹوپی جو شہرستان زرّیں سے لائے تھے عُمرو کو عطا کی اور کہا کہ یہ انمول تُحفہ ہم تجھے دیتے ہیں۔ عُمرو نے اُلٹ پلٹ کر اس ٹوپی کو دیکھا اور مُنہ بنا کر کہا:

"ایسی بھدّی ٹوپی میں نے اپنی عُمر میں پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔ کیا جناب والا کو اس ٹوپی کے لیے میرا ہی سر فالتو نظر آیا ہے؟"

امیر حمزہ نے ہنستے ہوئے وہ ٹوپی عُمرو کے ہاتھ سے لی اور اپنے سر پر رکھ لی۔ ٹوپی کا سر پر رکھنا تھا کہ امیر حمزہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ دیکھ کر عُمرو چِلاّ اُٹھا:

"حمزہ بھائی، تمھیں خُدا کا واسطہ یہ ٹوپی مُجھ کو دے دو۔ اس میں تو وہی خاصیّت ہے جو میرے سبز کمبل میں ہے۔"

تب حمزہ نے ٹوپی اُتاری اور سب کو دکھائی دینے لگے۔ عُمرو نے وہ ٹوپی اُن سے لے کر اُسے بوسہ دیا اور کہنے لگا:

"ابھی شہر دمشق کے اندر جاتا ہوں اور نوشیرواں، بختک، ژوپین اور ہوم کے جُوتے مارتا ہوں۔"

یہ سُن کر حمزہ ناراض ہوئے اور کہا:

"خبردار، ایسی ذلیل حرکت نہ کیجیو، ورنہ دُنیا کے بہادروں میں میرا نام کبھی نہ لکھا جائے گا۔ اگر تُو اِسی اِرادے سے جارہا ہے تو یہ ٹوپی واپس کر۔ واقعی یہ تیرے لائق نہیں۔"

تب عُمرو نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ کوئی گِری ہوئی حرکت نہ کرے گا اور خط پہنچا کر واپس چلا آئے گا۔

عُمرو نے شہر پناہ کے قریب پہنچ کر پہرے داروں سے کہا:

"مجھے اندر آنے دو۔ امیر حمزہ کا قاصِد ہُوں اور ہوم کے نام خط لے کر آیا

ہوں۔"

پہرے داروں نے ہوم کو خبر کی۔ اُس وقت ژوپین ہوم کے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے پہرے داروں سے کہا جاؤ قاصد سے اُس کا نام پوچھ کر آؤ۔ ایک پہرے دار نے ادب سے کہا:

"حضور، ہم نے پہلے ہی اُس کا نام پوچھ لیا ہے۔ وہ اپنا نام عُمرو بتاتا ہے۔"

یہ سُن کر ژوپین کے ہوش اُڑے اور ہاتھ پیروں پر لرزہ طاری ہو ہوا۔ ہوم دمشقی نے جب ژوپین کی حالت دیکھی تو حیران ہو کر کہنے لگا: "اے ژوپین خیر تو ہے۔ تمہاری حالت کیوں بگڑی؟"

ژوپین نے ہکلاتے ہوئے کہا: "اے ہوم، میں اِس شخص عُمرو سے بے حد ڈرتا ہوں۔ اگر ہزار حمزہ ہوتے تب بھی کوئی پروانہ تھی مگر اِس ایک شخص عُمرو کا ہونا حد درجہ مصیبت اور آفت ہے۔ آدمی نہیں چھلاوہ ہے۔ اِس سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔"

ہوم اور بھی حیران ہُوا اور پُوچھنے لگا: ”کیا یہ شخص ایسا ہی جواں مرد اور پہلوان ہے؟“

”پہلوان تو نہیں مگر بڑے بڑے پہلوان اِس کے نام اور کام سے کانپتے ہیں۔“ ژوپین نے جواب دیا۔

اتنے میں بختک بھی وہاں آن پہنچا اور اُس نے جب سُنا کہ عُمرو قاصِد بن کر آیا ہے تو اُس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ وہ ہوم سے کہنے لگا:

”حضُور آپ اس قاصِد کو باہر ہی سے لوٹا دیں۔ اگر یہ شہر میں آ گیا تو سب کُچھ تلپٹ کر دے گا اور کوئی اس کا کُچھ نہ بگاڑ سکے گا۔“

”بھئی اب تو ہم ایسے شخص سے ضرور ملیں گے۔“ ہوم نے کہا ”ذرا دیکھیں تو چیز کیا ہے؟“

اس نے پہرے داروں کو حکم دیا کہ قاصِد کو فوراً ہمارے حضُور پیش کیا جائے۔ دم کے دم میں پہرے داروں نے عُمرو کو ہوم کے پاس پہنچا دیا۔ عُمرو

کی عجیب و غریب صورت اور حُلیہ دیکھ کر ہوم بے اختیار کھِلکھِلا کر ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا۔ تب عُمرو نے للکار کر کہا:

"زیادہ دانت نہ نکال۔ ایسا نہ ہو کہ تجھے اس سے زیادہ رونا پڑے۔"

"دنیا میں ایسا کون جواں مرد ہے جو مجھے رُلائے۔" ہوم نے گرج کر کہا۔

"اس میں کون سی جواں مردی خرچ ہوتی ہے، کہو ابھی سے آٹھ آٹھ آنسو رُلا دوں۔" عُمرو نے کہا۔

یہ سُن کر ہوم غصّے سے لال پیلا ہوا اور سپاہیوں سے کہا کہ پکڑ لو اِس بدمعاش کو۔ ہم سے گُستاخی کرتا ہے۔ سپاہی اور غلام چاروں طرف سے عُمرو پر جھپٹے مگر اُس نے سلیمانی ٹوپی سر پر رکھی اور اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہوم حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر عُمرو ہوم کے قریب پہنچا اور اُچھل کر ایک لات اُس کے دائیں جبڑے پر اِس زور سے جمائی کہ جبڑا گھوم گیا۔ ہوم کے دائیں ہاتھ اُس کا وزیرِ اعظم بیٹھا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ یہ حرکت

وزیرِ اعظم نے کی ہے، اُس نے ایک گھونسا وزیرِ اعظم کے اِس زور سے مارا کہ وہ بد نصیب ہوا میں تنکے کی طرح اُڑتا ہُوا شہر پناہ سے باہر جا گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

پھر عُمرو نے ہوم کے بائیں جبڑے پر لات جمائی۔ اُس رُخ پر ژوپین بیٹھا تھا۔ ہوم نے غضب ناک نظروں سے ژوپین کو دیکھا اور کہا: "اے بادشاہ، ذرا اپنے حواس میں رہ آیندہ ایسی حرکت کی تو وہاں ماروں گا جہاں پانی نہ ملے۔"

یہ سُن کر ژوپین حیران ہُوا۔ کہنے لگا۔ "آخر بات کیا ہے جو تُو مُجھ پر ناراض ہوتا ہے؟"

"تُو نے میرے جبڑے پر مُکّا کیوں مارا؟" ہوم نے آنکھیں نکال کر کہا۔

ژوپین نے قہقہہ لگایا اور کہا "مُجھے مُکّا مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ ارے بھائی یہ شرارتیں عُمرو عیّار کر رہا ہے۔"

ابھی ژوپین نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ دھم سے ایک لات اُس کے

پیٹ پر پڑی اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ اس کے بعد بختک کی پیٹھ پر دوسری لات پڑی اور وہ لڑکیاں کھاتا ہُوا سپاہیوں کے قدموں میں جا گرا۔ اب تو ہوم کے حواس بھی جواب دے گئے۔ پکار کر کہا:

"اے عُمرو، تیری یہ حرکتیں اچھّی نہیں۔ کیا حمزہ نے تجھے یہی تعلیم دی ہے کہ قاصد بن کر کسی کے جاؤ اور ایسی اوچھی حرکتیں کرو۔"

تب عُمرو نے سر سے سلیمانی توپی اُتاری اور قہقہے لگانے لگا۔ پھر کہا "میں نے تجھے پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ زیادہ دانت مت نکال ورنہ روئے گا۔"

ہوم اپنے ہونٹ کاٹنے لگا لیکن کُچھ جواب نہ دیا۔ آخر عُمرو نے حمزہ کا خط نکال کر اُس کی طرف پھینکا اور کہا: "اسے پڑھ کر مجُھے جواب دے تا کہ حمزہ سے کہوں"

ہوم نے خط پڑھا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ جب خط پڑھ چکا تو عُمرو نے کہا: "حمزہ سے کہنا کہ ہماری رگوں میں بھی خُون دوڑتا ہے۔ اِس

گُستاخی کا مزہ عنقریب اُسے چکھاؤں گا۔"

عُمرو وہاں سے رُخصت ہو کر اپنے لشکر میں آیا اور حمزہ سے سارا حال کہا۔ وہ کہنے لگے:

"میں چاہتا ہوں کہ جنگ ہونے سے پہلے ایک نظر ہوم دمشقی کو دیکھوں۔ میں نے اُس کی قوّت اور شہ زوری کی بہت داستانیں سُنی ہیں۔"

"یہ کون سا مُشکل کام ہے۔" عُمرو نے کہا۔ "کل کے روز میرے ساتھ چلیے۔"

اگلے روز رات کے وقت امیر حمزہ اور عُمرو عیّار شہر پناہ کے قریب پہنچے۔ خندق کو تیر کر پار کیا۔ پھر عُمرو نے کمند نکال کر فصیل پر پھینکی۔ اس کے سہارے دونوں اُوپر چڑھ کر شہر میں داخل ہو گئے اور ایک سرائے میں جا کر سو رہے۔ صُبح صُبح اُٹھے اور اُس میدان کو رُخ کیا جس میں ہوم دمشقی ورزش کیا کرتا تھا۔

عُمرو نے اپنی وضع سوداگروں کی سی بنائی اور حمزہ کو ایک حبشی غلام بنایا۔ پھر

دونوں وہاں پہنچے۔ دیکھا کہ ہوم چالیس من وزنی سونے کی اینٹ پر پاؤں رکھے کھڑا ہے اور چار سو پہلوان اُس کے پیر کو جنبش دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں مگر ہوم کا پاؤں اینٹ پر فولاد کی طرح جما ہوا ہے۔ آخر سب پہلوان تھک کر ہانپنے لگے۔ اِتنے میں ہوم نے اپنے پاؤں کو حرکت دی اور سب کے سب پہلوان تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر جا گرے۔ امیر حمزہ ہوم کی یہ قوّت دیکھ کر حیران رہ گئے اور دل میں خُدا کو یاد کیا کہ یا الٰہی اِس پر فتح دے۔

یکایک عُمرو عیّار تماشائیوں کی صف سے نکل کر ہوم کی طرف چلا اور ہاتھ باندھ کر کہا:

"جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔ میں ایک غریب سوداگر آپ کے شہر میں آیا ہوں۔ ایک حبشی غلام میرے ساتھ ہے۔ جسے میں نے ایک لاکھ اشرفیوں میں خریدا ہے۔ چند روز تک تو یہ غلام میرا حکم مانتا رہا مگر اب اِسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جسے چاہتا ہے اُٹھا کر زمین

پر دے مارتا ہے۔ بہت سے پہلوان اِس سے پِٹ چُکے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ جہاں پناہ اسے اپنے سامنے طلب فرمائیں اور سزا دیں۔" یہ کہہ کر عُمرو عیّار جھُوٹ مُوٹ آنسو بہانے لگا۔

ہوم دمشقی نے ساری داستان سُن کر کہا "اُس حبشی غلام کو فوراً ہمارے حضور میں حاضر کیا جائے۔ ذرا ہم بھی دیکھیں کہ اُس کے بدن میں کتنی جان ہے۔"

تب عُمرو نے تماشائیوں کی جانب رُخ کر کے آواز دی:

"او غلام اِدھر آ اور بادشاہ کے سامنے پیش ہو۔"

امیر حمزہ میدان میں آئے۔ عُمرو نے اپنی عیّاری سے کام لے کر اُنہیں ایک زبردست حبشی غلام کے روپ میں بدل دیا تھا۔ جس نے بھی اُنہیں دیکھا عش عش کر اُٹھا۔ خُود ہوم نے جب اِس غلام کا ڈیل ڈول دیکھا تو دِل پر خوف طاری ہوا مگر پھر سنبھل کر بولا:

"اے غلام، ہم نے تیرے آقا سوداگر سے یہ شکایت سُنی ہے کہ تُو اس کا حکم

نہیں مانتا۔“

”آپ نے بالکل صحیح سُنا ہے۔ میں اِس کا حکم کیوں مانوں؟ کسی شخص کو حق نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے انسان کو غلام بنائے اور اُن سے جانوروں کی طرح کام لے۔“

یہ سُن کر غصّے کے مارے ہوم کے مُنہ سے جھاگ اُڑنے لگا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ سونے کی اینٹ سے نیچے اُتر کر حمزہ کی طرف لپکا، مگر حمزہ نے بڑی پھُرتی سے اُچھل کر وار بچایا اور وہی چالیس من وزنی اینٹ اُٹھا کر اِس زور سے ہوم کی کمر پر ماری کہ وہ پٹخنیاں کھاتا ہوا ایک ہزار گز کے فاصلے پر جا گرا۔ حبشی غلام کی یہ قوّت دیکھ کر تماشائیوں اور پہلوانوں کے حلق سے چیخیں نِکل گئیں اور جس کا جدھر مُنہ اُٹھا اُدھر بھاگ نِکلا۔ اُدھر عُمرو دوڑا ہوا گیا اور سونے کی اِینٹ اُٹھا کر زنبیل میں ڈالی۔ اس میں ہوم اُٹھ کر دوبارہ حبشی غلام کی طرف بڑھا پھر مُنہ کی کھائی۔ اِس مرتبہ حمزہ نے اُسے سر سے اُونچا اُٹھایا اور اِس زور سے زمین پر مارا کہ زمین کانپ اُٹھی۔ ہوم کی پسلیاں ٹوٹیں اور ناک

کے راستے خُون جاری ہُوا۔

اتنے میں ژوپین اور بختک نامُراد بھی وہاں آن پہنچے۔ اُنھوں نے ایک حبشی غلام کو دیکھا کہ شیر کی طرح بپھرا ہُوا میدان میں چکّر لگا رہا ہے اور ہوم زمین پر پڑا کٹے ہوئے مُرغ کی مانند پھڑک رہا ہے۔ میدان سے سونے کی اینٹ بھی غائب ہے۔ بختک فوراً سمجھ گیا کہ حبشی غلام اور سوداگر کے بھیس میں حمزہ اور عُمرو عیّار ہیں۔ اُس کے اوسان خطا ہوئے۔ شہر میں جا کہ فوج کو جمع کیا اور میدان میں لے آیا۔ حمزہ نے بھی دونوں ہاتھوں میں تلواریں سنبھالیں اور دشمن پر بجلی بن کر ٹُوٹے۔ نہ جانے کتنے دُشمنوں کو جہنّم رسید کیا۔ میدان میں ہر طرف خُون ہی خُون تھا یا کٹے ہوئے ہاتھ بکھرے پڑے تھے۔

یکایک ہوم پیچھے سے آیا اور امیر حمزہ پر بے خبری میں تلوار کا وار کیا۔ عُمرو چلّایا کہ خبردار بُزدل ہوم پیچھے سے وار کرتا ہے لیکن اِس سے پہلے کہ حمزہ سنبھلیں، ہوم کی تلوار حمزہ کے سر کو زخمی کر گئی۔ اُنھوں نے پلٹ کر ہوم کو دیکھا اور اُسے مارنے کے لیے لپکے مگر وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا اپنے محل میں جا

چھپا۔ امیر حمزہ کے سر سے خون کا فوّارہ جاری تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ کم زور ہوتے جا رہے تھے۔ عُمرو اُنہیں سہارا دیتا ہُوا دروازے کی جانب لے گیا۔ دروازے پر بھی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آخر حمزہ نے دروازے پر لات ماری۔ اُس کا ایک کواڑ ٹُوٹ کر گِرا۔ پھر اُنہوں نے پانی سے بھری ہوئی خندق پار کی اور بے ہوش ہو کر گِر پڑے۔ لِندھور اور مُقبِل وفادار وغیرہ بھاگے بھاگے آئے اور اُن کو اُٹھا کر لے گئے۔

اُدھر ہوم نے نوشیرواں کو یہ خوش خبری سُنائی کہ حمزہ کا سر پھاڑ آیا ہوں اور اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکے گا۔ عین اُسی وقت بہت سے سپاہی زخمی حالت میں وہاں آئے اور اُنہوں نے بتایا کہ حمزہ نے لات مار کر دروازہ توڑ دیا اور خندق پار کر کے اپنے لشکر سے جا ملا۔

یہ سُن کر نوشیرواں ہوم مشقی سے کہنے لگا:

”تُم کہتے ہو کہ میں نے حمزہ کا سر پھاڑ دیا ہے اور وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے گا مگر یہ سپاہی کہتے ہیں کہ اُس نے لات مار کر شہر پناہ کا دروازہ توڑ دیا ہے۔“ ہوم

سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ شرمندہ ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

امیر حمزہ کے سر کا زخم مرہمِ سلیمانی لگانے سے چند روز کے اندر ٹھیک ہو گیا اور اُنھوں نے دمشق پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ کیا مگر اُنہی دِنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بختک بدمعاش نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے ایک آدمی کے ذریعے ایک خط شہزادی مِہر نگار کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا:

"شہزادی مِہر نگار کو معلوم ہو کہ حمزہ نے چوری چھپے حلب کی ایک شہزادی سے شادی کر رکھی ہے۔ یہ شہزادی ناصر شاہ کی بیٹی ہے اور حمزہ کا ایک بیٹا بھی ہے جو اب جوان ہو گیا ہے۔ حمزہ نے اب تک تجھے دھوکے میں رکھا ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ اس کے پنجے سے اپنے آپ کو آزاد کر کے اور اپنے باپ شہنشاہ نوشیرواں کے پاس چلی آ۔ ہم تیرے خیر خواہی کے لیے کہتے ہیں۔ آگے تجھے اِختیار ہے۔" فقط بختک۔

بختک مکّار کا یہ خط جب شہزادی مِہر نگار نے پڑھا تو اُس کے دِل میں بھی طرح طرح کے شک اور شبہے سر اُٹھانے لگے۔ اُس نے سوچا بختک ٹھیک کہتا ہے۔

حمزہ نے ضرور ناصر شاہ کی بیٹی سے شادی کرلی ہو گی۔ وہ اتنی رنجیدہ ہوئی کہ کھانا پینا، ہنسنا بولنا چھوڑ دیا اور اٹوانٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئی۔ سب نے بُہت پُوچھا کہ کیا ماجرا ہے، مگر شہزادی نے زبان نہ کھولی۔ آخر امیر حمزہ خود آئے اور پوچھنے لگے:

"اے شہزادی، تجھے کیا ہوا ہے جو یوں رنجیدہ ہے اور کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے؟"

"اے حمزہ، مُجھ سے کلام نہ کر۔ تُو نے مُجھے دھوکا دیا اور ناصر شاہ کی بیٹی سے چُپ چاپ شادی کرلی۔ میں نے سُنا ہے کہ تیرے ایک بیٹا بھی ہے۔ میں اب اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ جیسا کیا ویسا پایا۔ آیندہ مُجھے اپنی صُورت نہ دکھانا۔"

یہ کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ امیر حمزہ کو شہزادی کی یہ باتیں بے حد ناگوار گزریں اور جب سمجھانے بجھانے کے باوجود اُس کی ناراضی دُور نہ ہوئی تو حمزہ بھی طیش میں آ گئے اور کہنے لگے:

”میں بھی تیری صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔ شہزادہ اولاد مرزبان ہی تیرے لائق ہے۔ اُسے بُلا کر تجھے اُسی کے سپرد کرتا ہُوں۔“

اُسی وقت اولاد مرزبان کو اپنے پاس بُلایا۔ وہ کانپتا ہاتھ جوڑتا ہوا آیا اور چُپ چاپ کھڑا رہا۔ حمزہ نے اُسے گلے سے لگایا اور کہا: ”بھائی، مُجھے معاف کر دیا۔ جہاں تیرا جی چاہے چلا جا اور شہزادی مِہر نگار کو بھی اپنے ساتھ لے جا۔“

لِندھور، عُمرو عیّار اور مُقبِل وفادار نے جب امیر حمزہ کی زبان سے یہ بات سُنی تو حیران ہوئے اور اُنہیں اِس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اُنھوں نے کِسی کی ایک نہ سُنی اور گرج کر کہنے لگے۔ ”مُجھے قسم ہے، اگر کل صُبح میں نے مِہر نگار کو دیکھا تو اُسے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔“

اب تو سب حیران پریشان ہوئے۔ مِہر نگار کو اُس وقت اپنی غلطی معلوم ہوئی اور دل میں سوچا کہ حمزہ سچ کہتے ہیں۔ بے اِختیار رو پڑی اور معافی مانگنے لگی، لیکن حمزہ نے کہا:

”بہتر یہی ہے کہ تُم اِس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ میں قسم کھا چُکا ہوں اور اگر میں نے کل صُبح تمہاری شکل دیکھ لی تو زندہ نہ چھوڑوں گا۔“

تب مِہر نگار نے سر جھکا لیا اور عُمرو عیّار سے کہنے لگی۔ ”بھائی عُمرو، تُم میرے ساتھ چلو۔“

عُمرو نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں مقبل وفادار کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں پھر حاضِر ہُوں گا۔“

مُقبِل وفادار امیر حمزہ کے پاس آیا اور عرض کی کہ اگر حکم ہو تو میں مِہر نگار کے ساتھ جاؤں۔ اُنہوں نے کہا جاؤ۔ تب مُقبِل نے حمزہ کے قدم چُومے اور اپنے سواروں سمیت مِہر نگار کے ساتھ روانہ ہوا۔ اولاد مرزبان بڑا خوش تھا اور زمین پر قدم نہ رکھتا تھا لیکن مِہر نگار نے اُسے کہلا بھیجا کہ تُو اب بھی میرا غلام ہے اور خبردار کِسی گستاخی یا بے ادبی کا خیال دل میں نہ لانا ورنہ اپنا خنجر تیرے سینے میں اُتار دوں گی۔

اولاد مرزبان یہ پیغام سُن کر بے حد ڈرا اور دل میں کہا شہزادی سچ کہتی ہے۔ مُجھے کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جان کھوؤں۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے اسے اپنے شہر میں لے جاؤں اور بعد میں زبردستی شادی کر لوں۔

یہی سوچتا ہوا وہ اپنے شہر میں پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ نہایت دھُوم دھام سے شہزادی مہر نگار کے استقبال کو روانہ کیا۔ اولاد مرزبان کا چھوٹا بھائی اطمینان سے حکومت کر رہا تھا۔ اُس کے وہم میں بھی نہ تھا کہ بڑا بھائی اچانک آ جائے گا اور تخت و تاج اُس کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جب مقبل وفادار سے اُس کی ملاقات ہوئی تو مقبل نے اُس کے کان میں کہا:

”اولاد مرزبان تو پاگل ہو گیا ہے اپنی شکل صورت آئینے میں دیکھتا نہیں اور چلا ہے نوشیر واں کی بیٹی سے شادی کرنے۔ خود شہزادی بھی اُس سے نفرت کرتی ہے لیکن مُجھے یقین ہے کہ وہ تجھ سے شادی کرنے پر تیّار ہو جائے گی۔ مگر اِس سے پہلے یہ کام کر کہ اپنے شہر میں واپس جا اور اولاد مرزبان کو مار ڈال۔“

چھوٹے بھائی کی کھوپڑی میں یہ بات سماگئی۔ شہزادی مِہر نگار سے شادی کرنے کی خوشی میں بالکل اندھا ہو گیا۔ سوچے سمجھے بغیر شہر واپس آ گیا اور اولاد مرزبان کا سر تن سے جُدا کیا۔ تب مقبل نے ہوشیاری سے کام لے کر اُس بے وقوف کو بھی ٹھکانے لگایا اور اپنی فوج کی مدد سے شہر پر قبضہ کر کے حکومت سنبھال لی۔

اُدھر امیر حمزہ نے شہزادی مِہر نگار کو رُخصت تو کر دیا، لیکن بے حد رنجیدہ رہنے لگے۔ ہنسنا بولنا بالکل چھوڑ دیا اور یار دوستوں کو سختی سے ہدایت کر دی کہ کوئی شخص میرے سامنے مِہر نگار کا ذکر نہ کرے۔ بختک اور ژوپین وغیرہ کو اس قصے کا علم ہوا تو بے حد خوش ہوئے اور بغلیں بجانے لگے۔ بختک نامراد نے نوشیرواں کو نمک مرچ لگا کر سارا قصّہ سُنایا اور کہا:

"جہاں پناہ، یہ آپ کی سخت توہین ہے کہ حمزہ نے شادی مہر نگار کو یُوں نکالا۔ اب سُنا ہے اولاد مرزبان اُسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

نوشیرواں اپنی پیاری بیٹی کی یاد میں دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ آخر اُس نے مدائن

جانے کا فیصلہ کیا۔ دمشقی نے بہترا منع کیا کہ فصیل کے باہر امیر حمزہ کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا ہے اور ہر طرف سے راستے بند ہیں۔ آپ کیوں کر مدائن جائیں گے۔ لیکن نوشیر واں نے ایک نہ سُنی اور قاصد کے ذریعے حمزہ کو کہلا بھیجا کہ میری تمہاری دشمنی نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ اِس لیے میرا راستہ نہ روکو اور مُجھے مدائن جانے دو۔ امیر حمزہ نے بادشاہ کا یہ پیغام سُنا تو پچھلی باتیں یاد آئیں اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نوشیر واں کو جواب بھیجا کہ میں اب بھی آپ کا خادم ہوں۔ دشمنوں نے میرے خلاف آپ کے کان بھرے ہیں۔ آپ بخوشی مدائن جاسکتے ہیں، لیکن ہوم اور ژوپین کی سفارش نہ کیجیے۔ کیوں کہ اُن دونوں کو میں اپنے ہاتھ سے ہلاک کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔

امیر حمزہ کا یہ پیغام پاکر نوشیر واں اپنی بچی کھُچی فوج کے ساتھ شہر دمشق سے باہر نکلا اور مدائن کی جانب چل دیا۔ بختک اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا مگر انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جب نوشیر واں چلا گیا تو حمزہ نے ایک روز دمشق پر زور دار حملہ کیا۔ تین دن تک نہایت گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ہزاروں سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ آخر میں ہوم دمشقی حمزہ کے ہاتھوں مارا گیا۔

ژوپین اپنی عیّاری اور چالاکی کی وجہ سے بچ گیا اور اپنی فوج کو بھی بچا کر وہاں سے بھاگا اور کوہستان میں جا کر بہمَن بادشاہ کے پاس پناہ لی۔ بہمَن بڑا زور آور اور زبردست بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس کی فوج میں دس لاکھ سپاہی تھے اور ہر سپاہی فولاد کی زرہ پہنتا تھا۔ کوہستان کے ہزاروں میل لمبے چوڑے علاقے پر اُس کی حکومت تھی اور وہ اپنے آپ کو نوشیر واں سے بھی بڑا بادشاہ سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے شہزادی مِہر نگار سے شادی کی خواہش بھی ظاہر کی تھی جسے نوشیر واں نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ بہمَن کو نوشیر واں پر حملہ کرنے کی جرأت تو نہ ہوئی مگر دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھاتا اور جنگ کے منصوبے بناتا رہا۔ اب ژوپین کی زبانی نوشیر واں کی تباہی و بربادی کا قصّہ سُن کر بہت خوش ہوا اور پوچھنے لگا: ”شہزادی مِہر نگار آج کل کہاں ہے؟ مجھے جلد

آگاہ کرو تا کہ میں اُسے اپنے قبضے میں لاؤں۔"

ژوپین کم بخت نے اسے بتایا کہ "حمزہ نے ناراض ہو کر شہزادی کو اولاد مرزبان کے حوالے کیا ہے اور وہ اُسے لے کر اپنے شہر کو چلا گیا ہے مگر مُجھے یقین ہے کہ وہ شہزادی سے شادی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔" دراصل اِس وقت تک یہ بات کِسی کو بھی معلوم نہ تھی کہ اولاد مرزبان کا کیا حشر ہوا اور اُس کے شہر پر کِس کی حکومت ہے۔

امیر حمزہ کے بیٹے

نوشیر واں مدائن جانے کے بجائے اولاد مزبان کے شہر میں گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مُقبِل وفادار کی حکومت ہے۔ اولاد مرزبان کو اُس کے چھوٹے بھائی نے ہلاک کیا اور چھوٹے بھائی کو مُقبِل وفادار نے جہنّم رسید کیا۔ شہزادی مِہر نگار نے اپنے باپ کے آنے کی خبر پائی تو بے حد کوش ہوئی اور شہر سے باہر نکل کر اُس کا استقبال کیا۔ نوشیر واں نے اُسے گلے سے لگایا اور کہا:

"بیٹی، اب تُم میرے ساتھ مدائن واپس چلو اور وہیں رہو۔ مُجھے یقین ہے کہ حمزہ کی ناراضی کُچھ عرصے میں دُور ہو جائے گی۔"

تب شہزادی نے بختک کا لکھا ہوا رقعہ نکال کر نوشیر واں کو دکھایا۔ اس وقت

خواجہ بزُرجمہر نے بھی یہ رقعہ دیکھا اور سمجھ گئے کہ ساری شرارت اسی بدمعاش کی ہے۔ نوشیرواں کا رنگ لال بھبھوکا ہو گیا۔ بختک یہ کیفیّت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا اور جھٹ بادشاہ کے پیروں پر گر پڑا۔ نوشیرواں نے اُسے ٹھوکر ماری اور کہا:

"اے نامُراد، ہم نے ہمیشہ تیری خطائیں معاف کی ہیں مگر اب تیری حرکتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ حمزہ کی دُشمنی میں تُو نے ہمارا اور ہماری بیٹی کا بھی خیال نہ کیا۔ بہتر یہی ہے کہ تیرے ناپاک جسم کی بوٹیاں کر کے کتّوں کے آگے ڈال دی جائیں۔"

یہ کہہ کر جلّاد کو طلب کیا۔ ایک حبشی شیر کی کھال اوڑھے اور کندھے پر چار من وزنی کلہاڑا رکھے حاضر ہوا۔ نوشیرواں نے اُسے کہا:

"اس بدبخت کو قتل میں لے جاؤ اور اِس کے جسم کی بوٹیاں کر کے کُتّوں اور چیل کوؤں کو کِھلا دو۔"

جلّاد نے بختک کے سر کے بال پکڑ کر اُسے زمین پر گھسیٹا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ بختک کی چیخیں آسمان تک جا رہی تھیں۔ خواجہ بزُرجمہر بڑے رحم دِل بزرگ تھے۔ اُن سے یہ نظارہ دیکھا نہ گیا۔ وہ نوشیرواں کے سامنے گئے اور بختک کی سفارش کرنے لگے۔ نوشیرواں نے کہا:

"خواجہ صاحب، آپ ہمیشہ اِس موذی کی سفارش کرتے ہیں حالانکہ یہ آپ کا بھی جانی دُشمن ہے۔"

"حضور میری جان بختک کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس کے ہاتھ میں ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔"

خواجہ بزُرجمہر نے جواب دیا۔ "یہ بے چارا بھلا مُجھے کیا مارے گا۔ میں اِس لیے اِس کے ساتھ بھلائی کرتا ہوں کہ شاید یہ کبھی سیدھی راہ پر آ جائے۔"

بختک اُٹھ کر خواجہ بزُرجمہر کے قدموں پر گِرا اور رونے لگا۔ لیکن اُس کا یہ رونا دھونا سب بناوٹ تھی۔ وہ دِل میں یہی کہہ رہا تھا کہ جہاں موقع پاؤں،

بزُرجمہر کر موت کے گھاٹ اُتار دوں گا۔ آخر نوشیرواں کو اُس پہ رحم آیا۔ جلّاد سے کہا کہ اِس کی پیٹھ پر دس کوڑے مار کر چھوڑ دو۔ جلّاد نے دس کوڑے پوری قوّت سے بختک کی ننگی پیٹھ پر مارے۔ اُس کی پیٹھ لہُولہان ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ تب چار غلام اُسے اُٹھا کر لے گئے اور ایک خیمے میں پھینک آئے۔ ایک ماہ تک بختک کی بیوی اُس کے زخموں پر ہلدی چونا تھوپتی رہی۔ پھر وہ تندرست ہُوا۔

اِدھر امیر حمزہ نے اپنے لشکر کو کُوچ کا حکم دیا۔ اُنہیں جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ کوہستان کا بادشاہ بہمَن شہزادی مِہر نگار کو چھین لانے کی کوشش میں ایک بڑے حملے کی تیّاریاں کر رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ مدائن پر فوج لے کر آجائے۔ ژوپین تاتاری بھی اپنی فوج لیے اُس کے ساتھ ہے۔

امیر حمزہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے مدائن کے سامنے پہنچے اور عُمرو عیّار کو نوشیرواں کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ شہر آنے کی اجازت طلب کی جائے۔ بادشاہ کے محل میں گیا۔ بادشاہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ شہزادی

مِہر نگار نے عُمرو کو سارا قصّہ سُنایا اور بختک کا بھیجا ہوا جعلی رقعہ بھی اُس کے حوالے کیا تا کہ حمزہ کو دِکھائے۔ نوشیرواں نے شہر کے لوگوں کو حکم دیا کہ جشن کی تیّاریاں کریں اور حمزہ کا شاندار استقبال کر کے اُسے شہر میں لائیں۔ یہ سُن کر لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اُسی وقت مدائن کو دُلہن کی طرح سجانے لگے۔

تین روز بعد نہایت شان و شوکت سے امیر حمزہ اور اُن کے ساتھی مدائن میں داخل ہوئے۔ حمزہ اب سمجھ گئے تھے کہ شہزادی مِہر نگار بے قصور ہے اور یہ سب بد معاشی بختک کی تھی۔ وہ سیدھے محل میں گئے۔ شہزادی نے اُنہیں سچّے دِل سے معاف کر دیا۔ اُس کے بعد نیک ساعت دیکھ کر نوشیرواں نے اپنی بیٹی کی شادی امیر حمزہ سے کر دی اور سب آپس میں مِل جُل کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اِسی طرح کئی سال گزر گئے۔ خُدا نے امیر حمزہ کو شادی کے ایک سال بعد دو بیٹے عطا کیے تھے۔ یہ دونوں نہایت خوب صورت اور ذہین تھے۔ حمزہ نے

بڑے بیٹے کا نام قباد شہریار اور چھوٹے کا عامِر رکھا۔ خواجہ بزُرجمہر، لِندھور، عادی پہلوان اور استفتانوش کی نگرانی میں اِن بچّوں کی تعلیم وتربیت ہونے لگی۔

یہ دونوں بچّے شروع ہی سے بے حد نڈر اور بہادُر تھے۔ تیر کمان اور تلوار لے کر بے دھڑک جنگل میں گھُس جاتے اور درندوں کو مار ڈالتے۔ گھُڑ سواری، نیزہ بازی اور کُشتی کے فن میں بھی آہستہ آہستہ اُنھوں نے مہارت حاصل کرلی۔ پورے ملک میں اُن کے برابر کوئی نشانچی اور گھُڑسوار نہ تھا۔ حمزہ اور شہزادی مِہرنگار اِن لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور اُن کے لیے دعائیں کرتے۔

بختک نامراد اِن لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر جلتا اور حسد کرتا لیکن بے بس تھا۔ بادشاہ کے کان بھرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر سب حالات ژوپین کو لکھ بھیجے اور اُس کو مجبور کیا کہ نوشیرواں کو بھڑکائے تاکہ وہ حمزہ اور اُس کی آل اولاد کو مدائن سے نکالے۔ ژوپین مکّاری میں بختک سے

بھی کئی قدم آگے تھا۔ اُس نے ایک خط اپنے خاص آدمی کے ہاتھ نوشیر واں کو بھیجا جس میں لکھا تھا۔ ''شہنشاہ نوشیر واں کو معلوم ہو کہ اب اُن کی بادشاہت کے دِن ختم ہوئے۔ حمزہ اب تک شاہی عِزّت نہیں رکھتا تھا، مگر اب اُس کے ہاں دو بیٹے پیدا ہو گئے ہیں۔ جب وہ بڑے ہوں گے تو تیرا تخت چھین لیں گے اور ایران کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر عربوں کے پاس چلی جائے گی اور یہ نہایت ذلّت کی بات ہو گی۔ بہمَن بڑا زور آور اور بہادر بادشاہ ہے۔ اگرچہ اُس کی آپ سے دشمنی ہے مگر حمزہ کے مقابلے میں وہ اب بھی آپ سے صلح صفائی کرنے کو تیّار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر نوشیر واں میرا ساتھ دے تو میں حمزہ کا قصّہ پاک کرنے کا عہد کرتا ہوں۔ اِس طرح سلطنت ہمیشہ ایرانیوں ہی کے پاس رہے گی۔''

نوشیر واں نے ژوپین کا یہ خط پڑھا تو سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر خواجہ بزُرجمہر کو بُلا کر خط دِکھایا اور مشورہ طلب کیا۔ بزُرجمہر نے کہا:

''اے شہنشاہ، یہ سب دُشمنوں کی چالاکی اور عیّاری ہے۔ امیر حمزہ کو یہ لوگ

کبھی شکست نہ دے سکیں گئے اور یہ حسد کی بنا پر آپ کو ایسی ایسی باتیں لکھتے ہیں۔ اگر حمزہ چاہتا تو اپنی قوّت کے بل بوتے پر بہت پہلے آپ کا تخت چھین سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا اور نہ آیندہ ایسا کرے گا کیوں کہ وہ ایک شریف باپ کا بہادر بیٹا ہے۔ اب رہا تخت و تاج کے ولی عہد کا معاملہ تو امیر حمزہ کے بیٹھے کوئی غیر نہیں۔ آپ ہی کے نواسے ہیں۔ ژوپین کو لکھ دیکھے کہ حمزہ کے بیٹے اب شاہی خاندان میں شامل ہیں، اِس لیے میرے بعد اُن کا تخت پر بیٹھنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔"

خواجہ بزُرجمہر نے اپنی طرف سے بادشاہ کے دِل سے یہ خیال نکالنے کی بہتیری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ بختک نے موقع پا کر ژوپین کی وکالت کی اور کہا:

"حضور، آپ ایک مرتبہ بہمَن کے پاس کوہستان چلیے تو سہی۔ اُس کے پاس دس لاکھ سپاہی ہیں۔ وُہ خود بھی ایسا زبردست پہلوان ہے کہ حمزہ جیسے دس پہلوان بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ ساری دنیا میں پہلے ہی بدنام ہو چکے

ہیں۔ سلطنت بھی ہمیشہ کے لیے آپ کے خاندان سے نکل کر عربوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ کہنے کو تو عامِر اور قباد شہریار آپ کے نواسے ہیں لیکن بیٹے تو امیر حمزہ کے کہلائیں گئے اور نام حمزہ ہی کا چلے گا۔"

غرض اُس نے نوشیر واں کو اپنی باتوں سے ایسا ڈرایا کہ وہ کُچھ سوچے سمجھے بغیر بہمَن کے پاس جانے کے لیے تیّار ہو گیا اور ایک اندھیری رات کو اس نے اپنے چند جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ مدائن سے باہر قدم رکھا اور تیزی سے کوہستان کی جانب روانہ ہو گیا۔

اُدھر جاسوسوں نے بہمَن کو خبر دی کہ نوشیر واں مدائن سے آتا ہے۔ وہ یہ خبر سُن کر بے حد خوش ہوا۔ ژوپین کی پیٹھ ٹھونکی اور کہنے لگا کہ بہت دِن بعد میرے دِل کی آرزو پوری ہوئی ہے۔ نوشیر واں سے گِن گِن کر بدلے نہ لوں تو میرا نام بھی بہمَن نہیں۔ تب ژوپین نے اُسے سمجھایا کہ یہ بات بادشاہوں کی شان کے خلاف ہے کہ اپنے ہم مرتبہ شخص کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ اب تمہیں چاہیے کہ تم اُس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور اُس کا دِل

مُٹھّی میں لینے کی کوشش کرو۔

بہمَن چند منزلیں نوشیرواں کے استقبال کو گیا اور اُسے بڑی عزّت کے ساتھ اپنے عالی شان شہر میں لایا۔ شہر کی رونق اور بڑی بڑی عمارتیں دیکھ کر نوشیرواں حیران رہ گیا اور جب اپس نے بہمَن بادشاہ کا محل دیکھا جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے دل میں کہا، بے شک بہمَن میرے مقابلے کا بادشاہ ہے اور کیا عجب کہ یہ حمزہ کو میرے مُلک سے نکالے اور میری سلطنت دوبارہ مُجھے واپس دلائے۔

چند روز بعد نوشیرواں کی خواہش پر بہمَن نے ایک خط امیر حمزہ کے نام لکھ کر روانہ کیا۔ اُس کا مضمون یہ تھا:

"اے حمزہ، تیری حرکتیں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ تو نے اپنے مُحسن نوشیرواں کو اِتنا پریشان کیا ہے کہ وہ مُلک چھُوڑ کر ہمارے ہاں پناہ لینے کے لیے آیا۔ اب مُجھ میں صبر کی تاب نہیں ہے۔ اِس لیے جنگ کے لیے تیّار ہو جا۔ اگر ہمّت ہے تو میرے مُلک کوہستان میں آ یا مُجھے ملک پر چڑھ آنے کی

اجازت دے۔ پھر کل نہ کہیو کہ بہمَن نے بے خبری میں حملہ کیا۔"

امیر حمزہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو وہ اپنے دوستوں سے کہنے لگے:

"نوشیر واں کی قسمت ہی میں جب دَر بدر کی ٹھوکریں لکھی ہیں تو ہم کیا کریں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اُس کے دل سے بُرے وہم نکال دوں مگر وہ کانوں کا کچّا اور عقل کا کورا ہے۔ بختک اور ژوپین نے بہکانے سے چُپ چاپ یہاں سے نکلا اور بہمَن کے پھندے میں جا پھنسا۔"

اِس کے بعد اُنہوں نے بہمَن کے قاصد کو جواب میں خط لکھ کر دیا کہ "اے بہمَن میں نے تیری قوّت اور شان و شوکت کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ تجھ سے ملنے کی بھی خواہش تھی۔ اب اچھا ہُوا کہ تُو نے خُود دعوت نامہ بھیج کر مجُھے بُلوایا۔ چند دِن اور صبر کر۔ مَیں تیرے مُلک میں پہنچتا ہوں اور اس کے بعد تُو خُود اپنا حشر دیکھ لے گا۔"

دوستوں نے امیر حمزہ کو مشورہ دیا ہے اب نوشیر واں خُود ہی تخت چھُوڑ کر چلا

گیا ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ دونوں لڑکوں میں سے بڑے لڑکے قباد شہریار کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ امیر حمزہ کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اُنہوں نے قباد شہریار کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ایک نیک ساعت اور اچھّے دِن تخت پر بیٹھنے کی رسم بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ محتاجوں اور فقیروں میں اشرفیاں لُٹائی گئیں اور چالیس دِن تک سلطنت میں جشن رہا۔

بہمَن پر حملہ

اکتالیسویں دِن امیر حمزہ نے اپنے لشکر کو تیّار ہونے کا حکم دیا اور بڑے کر و فر سے کوہستان کی جانب روانہ ہوئے۔ اُدھر بہمَن بھی غافل نہ تھا۔ اُس کے جاسوس پَل پَل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ جب اُنہوں نے یہ خبر دی کہ حمزہ کا لشکر کوہستان بہمَن کے نزدیک آن پہنچا ہے تب بہمَن نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو طلب کیا۔ اُس کا نام ہُومان تھا اور کہتے ہیں کہ قوّت و شجاعت میں اپنے باپ سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ بہمَن نے اپنے بیٹے سے کہا:

"اے فرزند، ہم نے سُنا ہے کہ حمزہ ہم سے جنگ کرنے کے لیے لاؤ لشکر لے کر سرحدوں کے قریب آ پہنچا ہے۔ اب تُو فوراً دس ہزار زرہ پوش سوار لے کر جا اور اُن کا راستہ روک تاکہ وہ پہاڑ پر نہ چڑھ سکیں۔"

ہُومان نے نیام سے تلوار نکال کر اُسے بوسہ دیا، گردن جھُکائی اور باپ کو فوجی سلام کر کے اُلٹے قدموں لوٹا۔ وہ دس ہزار سوار لے کر ایک بلند پہاڑ کے دامن میں داخل ہوا اور پہاڑ پر اپنے سواروں کو بٹھا دیا۔ حمزہ کے لشکر کا پہلا دستہ عادی پہلوان کی نگرانی میں سب سے آگے تھا اور جونہی یہ دستہ دو پہاڑوں کے درمیان واقع ایک تنگ درّے میں داخل ہوا، پہاڑ پر سے کئی مَن وزنی پتھّروں کی بارش ہونے لگی۔ اِس کے ساتھ ہی ہزاروں کی تعداد میں تیر سنسناتے ہوئے آنے لگے۔

عادی پہلوان کے حواس گُم ہو گئے۔ اپنی جان بچانے کی خاطر ایک بڑی چٹان کے نیچے جا چھُپا اور وہیں سے حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے سپاہیوں پر حکم چلاتا رہا لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کے دستے کے بہت سے سپاہی ہلاک ہو چکے تھے اور باقی سپاہی بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اِتنے میں کسی نے امیر حمزہ کے بیٹے عامِر کو خبر دی کہ عادی پہلوان کے دستے کی حالت تباہ ہے۔ دُشمن پہاڑ کی چوٹی سے پتھروں اور تیروں کی بارش برسا رہا

ہے۔ تب عامِر نے اپنی فوج کو تیزی سے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ عامِر کے دائیں بائیں لِندھور، استفتانوش جیسے عظیم پہلوان بھی تھے۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر دیکھا کہ واقعی بہت سے سپاہی مارے جا چُکے ہیں۔ عادی پہلوان ایک چٹان کے نیچے کھڑا ہانپ رہا ہے۔ تب لِندھور نے قہقہہ لگایا اور کہا:

"واہ عادی بھائی، تُم نے تو پہلوانی کو نام ہی ڈبو دیا۔ کھانے پینے کے شوق نے تُم کو کسی کام کا نہ رکھا۔"

عادی یہ بات سُن کر جھلّایا اور غصّے میں آن کر ایک گھونسا لِندھور کے جبڑے پر مارا۔ لِندھور اُلٹ کر دھم سے زمین پر گِرا لیکن پھر ہنستا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا:

"عادی بھائی، تمہاری جگہ کوئی اور شخص مجھے یوں گھونسا مارنے کی جرأت کرتا تو اُسے تارے دکھا دیتا۔"

”ابے جابڑا آیا تارے دکھانے والا۔“ عادی نے کہا۔ تب لِندھور آگے بڑھا اور ایک گھونسا اُس زور سے عادی کی موٹی گردن پر رسید کیا کہ عادی لٹّو کی طرح گھوما اور زمین پر ایسا گِرا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔

”کہو بھائی، تارے دکھائی دیئے یا نہیں؟“ لِندھور نے پوچھا۔ ”اگر نہ دِکھائی دیے ہوں تو ایک گھُونسا اور پیش کروں؟“

عادی خُون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا۔ لندھور کے ایک ہی گھونسے میں اُسے واقعی تارے نظر آ گئے تھے۔ تب حمزہ کے بیٹے اور استفتا نوش نے دونوں کو سمجھایا اور کہا کہ ہمن سے لڑنے آئے ہیں اور یہ موقعہ آپس میں زور آزمائی کا نہیں ہے۔

اِتنے میں پہاڑ کی چوٹی سے پھر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔ عامِر نے اپنے دستے کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں سے اُتر کر وہ اپنے سَروں کو ڈھالوں کے پیچھے چھُپالو اور تلواریں نیام سے نکال کر پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ یہ حکم پاتے ہی سپاہیوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ عامِر سب سے آگے

تھا۔ تھوڑی دیر میں کئی ہزار سپاہی اُوپر پہنچ گئے اور اُنہوں نے ہُومان کے آدمیوں پر اِس شدّت سے حملہ کیا کہ اُن کے پیر اُکھڑ گئے۔ ہُومان نے جب استفتانوش، لِندھور اور عادی جیسے دیوؤں کو آتے دیکھا تو چوکڑی بھُول کر وہاں سے بھاگا اور سیدھا بہمَن کے پاس گیا۔ اُس نے خوش ہو کر کہا:

"اے فرزند، تم بہت جلد واپس آ گئے۔ کیا دُشمن تمہارے خوف سے بھاگ گیا؟"

"جہاں پناہ، وہ آدمی نہیں۔ دیو ہیں" ہُومان چِلّایا۔ "اور دیوؤں سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں۔"

یہ سُن کر بہمَن غُصّے سے کانپنے لگا۔ اُسے ہُومان نے ایسی بُزدلی کی اُمّید نہ تھی۔ فوراً بید منگوایا اور اُسے بُری طرح پیٹنے لگا مگر ہُومان برابر یہی کہہ رہا تھا۔

"ابّا جان مجُھے جتنا بھی چاہے مار لیجیے۔ مگر میں اِن سے لڑنے کو تیّار نہیں۔ وُہ آدمی نہیں، جِن ہیں۔۔۔ دیو ہیں۔۔۔ آپ بھی اُن سے لڑنے کا خیال دل

سے نکال دیجیے۔"

یہ باتیں بہمَن کا خُون اور کھولا دیتیں اور وہ پھر بید برسانے لگتا۔ تب ژوپین اور نوشیرواں نے بہمَن کا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"اے بہمَن، کیا پاگل ہوا ہے؟ اپنے لڑکے کو مارے ڈالتا ہے؟ حمزہ کا راستہ روکنے کی کوشش کر، ورنہ وہ تیرے ملک کو تہس نہس کر دے گا۔"

بہمَن نے اُسی وقت اپنے تمام لشکر کو تیّار ہو جانے کا حکم دیا اور خود بہت سے پہلوانوں اور فوجی افسروں کو ساتھ لے کر سرحد کے قریب آیا۔ بہت دُور گرد کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ ژوپین نے کہا یہ حمزہ کی فوج ہے جو آندھی کی طرح چلی آ رہی ہے۔ بہمَن نے کہا :

"مجھے بتاؤ کہ حمزہ اِن میں کون سا ہے؟"

اِتنے میں حمزہ کی فوج کے عَلَم بردار نمودار ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں اُونچے اُونچے رنگ برنگے جھنڈے تھے اور یہ سب کے سب نہایت خوب صورت

سفید گھوڑوں پر سوار تھے۔ اِن عَلَم برداروں کے پیچھے چودہ ہزار سوار زرہ پوش تھے۔ پھر چالیس پہلوانوں کا ایک گروہ دکھائی دیا۔ اُن کے آگے آگے عادی پہلوان مست ہاتھی کی طرح جھُومتا ہوا چل رہا تھا۔ بہمَن نے عادی کو دیکھا تو دِل میں کہا ہُومان سچ کہتا ہے یہ تو گوشت پوست کا ایک پہاڑ چلا آتا ہے۔ شاید یہی حمزہ ہے۔ تب اُس نے چُپکے سے پُوچھا:

"کیا یہی امیر حمزہ ہے؟"

بختک نے مُسکرا کر جواب دیا "یہ حمزہ نہیں ہے۔ اُس کا دُودھ شریک بھائی اور لشکر کے ہراول دستے کا کمانڈر عادی پہلوان ہے۔"

اِتنے میں نقّاروں کا شور سُنائی دیا۔ بہمَن نے دیکھا کہ سفید ہاتھی پر ایک سیاہ فام دیو بیٹھا ہے اور بارہ من وزنی لوہے کا گُرز اُس کے کندھے پر رکھا ہے جسے وہ کبھی کبھی ہوا میں اُچھالتا ہے۔ سات سو ہاتھی اُس کے دائیں جانب اور سات سو ہاتھی بائیں جانب ہیں جِن کے اُوپر سونے چاندی کی چھتریاں تنی ہوئی ہیں۔ بہمَن نے بختک کے کان میں کہا:

”شاید یہی حمزہ ہے جو ہوا میں گُرز اُچھال رہا ہے۔“

”اِسے لِندھور کہتے ہیں۔ ہندوستان کا سب سے بڑا راجا ہے اور حمزہ کا دایاں بازُو ہے۔ کہتے ہیں کہ لِندھور نے حمزہ کے سوا آج تک دُنیا کے کِسی شہ زور سے شکست نہیں مانی۔“

”واقعی آدمی کیا ہے، دیو ہے۔ ہُومان سچ کہتا تھا۔“ بہمَن نے کہا۔

لِندھور کے بعد شہ پال ہندی کے بیٹے نمودار ہوئے۔ پھر یونان کے شہزادے آئے۔ اُن کے بعد رومی سپاہیوں کا شکر دکھائی دیا۔ سات بھائی اس لشکر کے آگے آگے سیاہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ اِس کے بعد سردار شیر بابک شروانی آیا۔ بہمَن نے پُوچھا ”یہ کون ہے۔“ بختک نے جواب دیا ”یہ شہنشاہ نوشیرواں کا سپہ سالار ہے۔ اب حمزہ سے مِل گیا ہے۔ ایران میں اِس سے بڑا پہلوان اور کوئی نہیں۔“

بہمَن کے اوسان آہستہ آہستہ خطا ہونے لگے۔ دِل میں کہا کہ بُرے پھنسے جو

حمزہ کو جنگ کی دعوت دی۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ جس کے ماتحت ایسے ایسے گرانڈیل پہلوان ہیں وہ خُود کتنا عظیم ہو گا۔

اچانک سونے کا ایک بلند چھتر دکھائی دیا۔ جس کے نیچے سُرخ رنگ کے ایک گھوڑے پر نہایت حسین اور بہادر نوجوان سوار آہستہ آہستہ راستہ طے کر رہا تھا۔ بہت سے پہلوان اُس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ادب سے چل رہے تھے۔ بہمَن نے پُوچھا:

"یہ خوب صُورت جوان کون ہے؟"

"یہ حمزہ کا دوسرا بیٹا عامِر ہے۔" بختک نے جواب دیا۔ یکایک بارہ ہزار آدمیوں کا ایک پیادہ لشکر نمودار ہوا۔ اُن کے سروں پر لمبوتری ٹوپیاں تھیں اور لباس بے ڈھنگے اور طرح طرح کے رنگوں سے رنگے گئے تھے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں کمندیں تھیں اور وہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اُن کے آگے آگے ایک شخص عجیب و غریب سامان سے لیس اُچھل پھاند کرتا ہُوا چلا آ رہا تھا۔ اس کی حرکتیں ایسی نرالی تھی کہ بہمَن

کوشش کے باوجود اپنی ہنسی روک نہ سکا اور بے اختیار کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے بختک سے پُوچھا:

”یہ کون لوگ ہیں اور اِن کے آگے کودنے پھاندنے والا مسخرہ کون ہے؟“

”جہاں پناہ، یہ عیّاروں کا لشکر ہے اور اُن کے سردار کا نام عُمرو ہے؟“ بختک نے مُنہ بنا کر کہا: ”قسم ہے آتش کدوں میں جلنے والی مقدس آگ کی کہ ہزار حمزہ پیدا ہوتے، تب بھی کچھ فکر نہ تھی، مگر یہ ایک بد ذات عُمرو پیدا نہ ہُوا ہوتا۔“

”کیا یہ بہت خطرناک آدمی ہے؟“ بہمَن نے پُوچھا۔

”بے شک اِس سے سبھی خوف کھاتے ہیں۔“ بختک نے جواب دیا۔

اتنے میں نشانِ عَلَم اژدہا پیکر کی آواز پیدا ہوئی۔ بہمَن نے پُوچھا یہ آواز کِس کی ہے؟ بختک نے کہا کہ یہ آواز حمزہ کے نشان کی ہے۔ اِس نشان کے آتے ہی عرب کا چاند حمزہ نمودار ہوا۔ وہ سیاہ قیطاس پر سوار تھے۔ اُن کے پیچھے گیارہ

ہزار ہاتھی اور تیس ہزار ترکی، حبشی ، مصری، رومی، چینی اور ہندی غلام آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ہاتھیوں پر تمام نامی گرامی پہلوان سوار تھے۔

یہ منظر دیکھ کر بہمَن کے دِل پر خوف طاری ہوا۔ وُہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر امیر حمزہ کو دیکھ رہا تھا اور اُسے یقین ہو گیا تھا کہ جو شخص اتنی قوّت اور ہیبت رکھتا ہے اُس سے لڑائی میں جیتنا آسان نہ ہو گا۔

امیر حمزہ کے لشکر نے ایک وسیع میدان میں پڑاؤ کیا۔ سُورج غروب ہو چُکا تھا اور رات کے اندھیرے تیزی سے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ بہمَن اپنے شہر میں چلا گیا اور اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ صُبح سُورج نکلتے ہی امیر حمزہ پر ہلّہ بول دیا جائے۔

اُدھر امیر حمزہ نے ایک اور خط بہمَن کے نام لکھوایا جس کا مضمون یہ تھا:

"کوہستان کے بادشاہ بہمَن کو معلُوم ہو کہ میرا نام حمزہ ہے۔ اٹھارہ برس کوہ قاف میں رہ کر آیا ہوں اور وہاں ہزاروں خبیث دیوؤں اور شیطانوں کو

ہلاک کیا ہے۔ اِس سے پہلے خُدا کے فضل سے میں نے دنیا کے نامی گرامی بادشاہوں اور پہلوانوں کو شکست دی ہے اور سب کو اپنا مطیع کیا ہے۔ مَیں نے نوشیرواں سے کبھی بدی نہیں کی بلکہ اُس نے خود اپنی خوشی سے شہزادی مِہر نگار کی شادی میرے ساتھ طے کر دی تھی۔ جب میں کوہ قاف گیا تو ژوبین اور دوہرے عیّاروں نے مِل کر شہزادی مِہر نگار کو لے جانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ میں نے نوشیرواں کے کہنے پہ اُن کو معاف کیا اور مدائن میں چلے جانے کی اجازت دی۔ مگر اب وہ بختک اور ژوبین کے بہکانے میں آ کر مدائن سے چوری چھُپے نِکلا اور تیرے پاس آ کر پناہ لی۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ میرا رُقعہ دیکھتے ہی نوشیرواں اور ژوبین کو رسّیوں سے باندھ کر میرے پاس حاضر ہو اور میری اطاعت قبُول کر۔ مَیں تجھے اپنے لشکر کا افسر بناؤں گا لیکن نافرمانی کی تو یہ جان لے کہ ایسی عبرت ناک سزا دُوں گا کہ تو نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔"

جب یہ خط لکھا جا چُکا تو حمزہ نے یاروں سے کہا کہ اِسے بہمَن کے پاس کون لے

کر جائے گا؟ عُمرو عیّار آگے بڑھا اور کہنے لگا: ”یہ کام میرا ہے اور میں ہی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں، میں تجھے بہمَن کے پاس نہ بھیجوں گا۔“ امیر حمزہ نے کہا ”بہمَن نڈر شخص ہے اور میں جانتا ہوں کہ تُو گُستاخی اور شرارت سے باز نہ آئے گا۔ ایسی حرکتوں سے میری بدنامی ہوتی ہے۔“

یہ سُن کر عُمرو شرمندہ ہو کر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ تب عامِر اپنی کرسی سے اُٹھے، باپ کے سامنے جا کر سلام کیا اور کہا۔ ”اگر حکم ہو تو میں بہمَن کے پاس جاؤں اور اِس خط کا جواب لاؤں؟“

امیر حمزہ نے مُسکرا کر بہادر بیٹے کی طرف دیکھا اور وُہ خط اُن کے حوالے کیا۔ عامِر اُسی وقت گھوڑے پر بیٹھے اور اکیلے ہی بہمَن سے ملنے چلے۔ راہ میں دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا جوان سُرخ گھوڑے پر بیٹھا آہستہ آہستہ سامنے سے آ رہا ہے۔ عامِر نے اپنا گھوڑا روکا اور آنے والے جوان سے کہا: ”کیوں صاحب، بہمَن کا شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟“

یہ سُن کر وہ جوان غصّے سے لال پیلا ہوا اور چلّا کر کہا۔ ”او بد نصیب، معلوم ہوتا ہے تیری قضا تجھے اِدھر لے آئی ہے۔ شہنشاہ بہمَن کا نام اِس بے ادبی سے لیتا ہے۔ ٹھہرا ابھی تیرا سر کاٹتا ہوں۔“

اجنبی جوان کی یہ بات سُن کر عامِر نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا: ”تمہارا نام کیا ہے اور تم جیسے پاگل کو کِس نے گھومنے پھرنے کی آزادی دے رکھی ہے۔“

”میرا نام ہُومان ہے اور میں بہمَن کا بیٹا ہوں۔“ اجنبی جوان نے گرج کر کہا اور تلوار نکال کر عامِر کی طرف بڑھا۔ عامِر نے بھی اپنی تلوار نکالی۔ دونوں میں کچھ دیر تک تلوار چلتی رہی۔ پھر یکایک عامِر نے ایک ہاتھ سے ہُومان کی کمر سے بندھی ہوئی پیٹی پکڑی، اُسے اُوپر اُٹھایا اور رکاب سے پاؤں نکال کر اُس کے گھوڑے کو ایسی لات ماری کہ وہ ہُومان کے نیچے سے نکل کر دس قدم دُور جا گرا۔ پھر عامِر نے ہُومان کو سر سے اُوپر گھُما کر چاہا کہ زمین پر دے ماریں کہ ہُومان نے گِڑگڑا کر امان طلب کی۔ عامِر نے اُسے آہستہ سے زمین پر پٹخ دیا اور کہا جہاں تیرا جی چاہے چلا جا اور جانے سے پہلے سُن لے کہ میرا

نام عامِر ہے اور میں امیر حمزہ کا بیٹا ہوں۔ یہ سُنتے ہی ہُومان کا کلیجا اُچھل کر حلق میں آیا۔ اُٹھ کر عامِر کے قدموں پر گِرا اور کہنے لگا: ”آفرین ہے آپ کی جواں مردی پر۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ آپ کِس مقصد کے لیے کوہستان جاتے ہیں؟“

”تیرے باپ بہمَن کے نام اپنے باپ حمزہ کی جانب سے ایک خط لے جاتا ہوں۔“ عامِر نے کہا۔

تب ہُومان نے اُنہیں صحیح راستہ بتایا اور کہا ہے کہ ہماری اِس لڑائی کا ذکر کِسی سے نہ کرنا ورنہ لوگ مُجھے بزدل کہیں گے۔ یہ کہہ کر رُخصت ہوا۔ ایک دوسرے راستے سے چل کر بہمَن کے پاس پہنچا اور قدم بوسی کر کے اپنی کُرسی پر بیٹھ رہا۔

تھوڑی دیر بعد دربانوں نے خبر دی کہ عامِر آتا ہے۔ بہمَن اپنی شاہانہ کُرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت دربار میں نوشیر واں، خواجہ بزُرجمہر، ژوپین اور بختک بھی موجُود تھے۔

عامِر نے ایک گھومتی ہوئی نظر اِن سب پر ڈالی اور اپنی ذہانت سے اندازہ کیا کہ اِن میں خواجہ بزُرجمہر کون ہیں۔ تب اُنہیں پہچان کر قریب گیا اور جھک کر کہا: ”خواجہ بزُرجمہر کو میرا سلام پہنچے۔“

”تجھ کو بھی بزُرجمہر کا سلام ہے اے فرزند۔“ بزُرجمہر نے محبّت سے کہا۔

یہ دیکھ کر ہُومان کا خون گرم ہُوا۔ کہنے لگا:

”اے حمزہ کے بیٹے، تُو نے اپنے نانا نوشیرواں کو سلام کیا نہ بہمَن بادشاہ کو۔ بلکہ ایک ادنیٰ وزیر اور بُڈّھے کو سلام کیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟“

”اِس کا سبب یہ ہے کہ خواجہ بزُرجمہر تمہاری طرح آگ کو نہیں پوجتے اور خُدا کو ایک جانتے ہیں۔ سچ کو سچ اور جھُوٹ کو جھُوٹ کہتے ہیں۔“ عامِر نے جواب دیا تب ہُومان لاجواب ہو کر چُپ ہو رہا۔

اِس کے بعد عامِر نے ریشمی تھیلی میں سے امیر حمزہ کا خط نکال کر اُن کی طرف بڑھایا۔ بہمَن نے مُہر چاک کر کے خط کھولا، پڑھا، سخت ناراض ہو کر پھاڑا اور

پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر عامِر کہنے لگے:

"اے بہمَن، اب بتا کہ امیر حمزہ کو تیری جانب سے کیا جواب دُوں۔ اُنہوں نے مُجھے ہدایت کی تھی کہ تیرے دربار میں کوئی گڑبڑ نہ کروں اِس لیے خاموش ہوں ورنہ اِس خط کو چاک کرنے کا مزہ چکھا دیتا۔"

یہ سُن کر بہمَن کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ اُس کے رُوبرو ایسی گُستاخی کِسی نے آج تک نہ کی تھی۔ اپنے بیٹے ہُومان کو حکم دیا کہ پکڑو اِس نابکار کو۔ ہُومان کُچھ دیر ہکّا بکّا اپنی جگہ بیٹھا رہا پھر باپ کا غضب دیکھ کر مجبوراً اُٹھا اور تلوار میان سے نکال کر عامِر کی طرف بڑھا۔ عامِر نے بے مثال پھُرتی سے ہُومان کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تلوار اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر نیچے گِر پڑی۔ پھر عامِر نے دوسرے ہاتھ کا گھُونسا اِس زور سے ہُومان کے جبڑے پر رسید کیا کہ وہ لُڑھکنیاں کھاتا ہُوا بہمَن کے پاؤں پر جا گِرا۔ اُس کے دانتوں سے خُون بہنے لگا۔ تب بہمَن کا ایک بھائی تلوار کھینچ کر عامِر پر لپکا۔ مگر عامِر نے اُسے بھی زمین پر پچھاڑا۔ پھر بہمَن کا دُوسرا بھائی گُرز لے کر عامِر پر جھپٹا۔ عامِر نے مار مار

کر اُس کا کچُومر نکال دیا اور جب وہ زمین پر گِر کر ہانپنے لگا تو عامِر نے بہمَن سے کہا:

”اے بہمَن، میرے باپ کا حکم تھا کہ تیرے دربار میں تلوار نہ نکالوں، تُو نے دیکھا کہ تین آدمی مُجھ پر حملہ کرنے کو آئے اور میں نے اپنی تلوار نہیں نکالی، ورنہ یہیں خُون کی ندیاں بہتی دِکھائی دیتیں۔“

”اے جوان، آفرین ہے تجھ پر۔“ بہمَن نے کہا۔ پھر چوب دار کو حکم دیا کہ شاہی خلعت لے کر آؤ۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے عامِر کو خلعت پہنایا اور کہا کہ اپنے باپ سے جا کر کہہ دے کہ صُبح کو ہمارے درمیان فیصلہ ہو جائے گا۔ عامِر نے واپس آ کر امیر حمزہ سے سب حقیقت کہی۔ اُنھوں نے بہادُر بیٹے کو گلے سے لگایا اور بہت پیٹھ ٹھونکی۔

مُنہ اندھیرے بہمَن کے لشکر سے نقّارہ بجنے کی آواز آئی اور دونوں فوجیں جنگ کے لیے تیّار ہوئیں۔ جب دشمن کے نقّاروں کی آواز امیر حمزہ کے کان میں پہنچی تو حکم دیا کہ ہمارے نقارچی بھی طبلِ جنگ بجائیں۔ پھر اُنھوں نے

پیغمبروں کے ہتھیار اپنے بدن پر سجائے، سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے اور فوجی سرداروں اور پہلوانوں کی سلامی لیتے ہُوئے اپنے لشکر کے عین بیچ میں آ گئے۔

اتنی دیر میں بہمَن کی بے انداز فوج بھی میدان میں صفیں جما چُکی تھی۔ بارہ نقیب درمیان میں آئے اور اُنہوں نے پُکار کر کہا:

"کون مرد ہے جو میدان میں نکلے اور اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے۔"

نقیب کی یہ للکار جب عامِر نے سُنی تو بے قرار ہو کر گھوڑے سے اُترے اور امیر حمزہ کی خدمت میں جا کر کہنے لگے: "ابّا جان، اجازت ہو تو میدان میں جاؤں اور دشمن سے دو دو ہاتھ کروں؟"

حمزہ نے محبّت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور کہا "جاؤ، تمہیں خُدا کو سونپا۔"

عامِر اشقر دیوزاد پر سوار ہو کر میدان میں آئے اور پُکار کر کہا:

”جو نہیں سُنتا وہ سُنے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ مجھے عامِر کہتے ہیں اور میں امیر حمزہ کا بیٹا ہوں۔ جسے موت کی آرزو ہے وہ میرے سامنے آئے۔“

عامِر کی آواز سُن کر بہمَن نے اپنے بڑے بیٹے ہُومان کی طرف دیکھا اور کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ تم اِس نوجوان کے مقابلے میں نکلو، ورنہ لوگ کہیں گے کہ بہمَن کے بیٹے بُزدل تھے۔“

اب تو ہُومان کے ہوش اُڑے۔ دو دفعہ عامِر کے ہاتھوں پِٹ چُکا تھا۔ سمجھا کہ اب واقعی مُوت آئی۔ اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تب دس مَن وزنی لوہے کا گُرز لے کر آیا اور اِسی شدّت سے حملہ کیا کہ عامِر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کی ہڈّیاں پسلیاں سُرمہ بن چکی ہوتیں۔ لیکن عامِر نے ہُومان کے سب وار گینڈے کی کھال سے بنی ہوئی ڈھال پر روکے اور جب وہ وار کرتے تھک کر ہانپنے لگا تب عامِر نے ایک زبردست نعرہ مار کر اُس کی کمر پکڑ لی اور گھوڑے پر سے اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ ہُومان کے حلق سے ایک خون ناک چیخ نِکلی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ عُمرو عیّار دوڑا آیا، اُسے رسّیوں سے باندھا اور زنبیل

میں ڈال کر لے گیا۔

ہُومان کی گرفتاری کے بعد اُس کے دونوں بھائی میدان میں آئے مگر عامِر نے دونوں کو شکست دی۔ اُن کو بھی عُمرو عیّار باندھ کر لے گیا۔ یہ دیکھ کر بہمَن کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ بیس مَن وزنی فولادی گُرز لے کر شیر کی طرح دھاڑتا ہوا میدان میں نِکلا اور عامِر سے کہا:

"اے جوان، ہوشیار ہو جا اور جی چاہے تو اپنے باپ حمزہ کو بھی مدد کے لیے پکار لے۔"

عامِر نے دِل ہی دِل میں خُدا کو یاد کیا اور جواب میں کہا:

"تجھ جیسے ایک ہزار آدمیوں پر مَیں، خُدا کے فضل سے اکیلا ہی بھاری ہوں۔ جلدی وار کر کہ مُجھے دیر ہوتی ہے۔"

تب بہمَن نے بھُنّا کر اپنا گُرز اُٹھایا اور اُدھر امیر حمزہ نے عامِر کی سلامتی کے لیے دُعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ عامِر نے بہمَن کے وار سے بچنے کے لیے ڈھال کے

پیچھے سر چھپایا لیکن بہمَن کی ضرب اتنی شدید تھی کہ گُرز جب ڈھال سے ٹکرایا تو آگ کا شعلہ نِکلا اور آسمان تک گیا۔ عامِر نے بدن سے پسینہ پھُوٹ نِکلا اور اُن کا گھوڑا بِدک کر شوخیاں کرنے لگا۔

عامِر نے سر سے ڈھال ہٹائی تو بہمَن نے چلّا کر کہا: ''اے حمزہ کے بیٹے، تُو ابھی تک زندہ ہے۔''

''بے شک، مارنے اور جلانے کی قُدرت خُدا کو ہے۔'' عامِر نے جواب دیا ''میں نے تجھ کو دو حملے اور دیے۔ اپنے جی کی حسرت نکال لے۔''

بہمَن کے دِل پر خوف طاری ہوا۔ لیکن پھر سنبھل کر اپنے گُرز سے دو وار اور کیے جو پہلے وار سے بھی زیادہ سخت تھے مگر خُدا نے عامِر کو بچایا۔ تب بہمَن نے اپنا گُرز ایک طرف پھینکا اور تلوار نکالی۔ عامِر نے بھی نیام سے تلوار کھینچی اور دونوں میں ایسی زبردست تلوار چلی کہ دوست دُشمن سب کے مُنہ سے آفرین نکلی۔ آخر دونوں کی تلواریں بیکار ہوئیں پھر اُنہوں نے نیزے سنبھالے اور اتنی دیر لڑے کہ نیزے بھی ٹوٹ کر گِر گرے۔ تب دونوں دُشمن

ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور زور آزمائی کرنے لگے۔ کبھی بہمَن عامِر کو دھکیلتا ہُوا دُور تک لے جاتا اور کبھی عامِر اُس کی مرمّت کرتا۔ شام تک دونوں ایسی بے جگری اور بے خوفی سے لڑے کہ بڑے بڑے پہلوان اور جنگ جُو حیران رہ گئے۔ جب دونوں لہُولہان ہوگئے اور سورج بھی غوب ہوا تو بہمَن نے کہا:

"اے حمزہ کے بیٹے، تیری ہمّت اور جرأت پر شاباش۔ کوئی شخص مُجھ سے اتنی دیر تک کبھی نہ لڑا تھا۔ اب اندھیرا چھا گیا ہے۔ تو بھی تھک چکا ہے اور میں بھی۔ بہتر یہ ہے کہ لڑائی ملتوی کریں اور کل پھر میدان میں آئیں۔"

"جیسے تیری مرضی۔" عامِر نے کہا "لیکن یاد رکھ کہ میں میدان سے پیچھے مُڑ کر جانے والوں میں نہیں ہوں۔ اِس لیے تو پہلے جا۔ میں بعد میں جاؤں گا۔"

یہ سُن کر بہمَن خاموش ہوا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس چلا گیا۔ عامِر بھی اپنے ساتھیوں سے آن ملے۔ حمزہ نے اُن کی پیشانی چومی اور سینے سے لگایا۔ پھر پُوچھا:

"اے فرزند، تُونے بہمَن کو کیسا پایا؟"

"ابّا جان، سچ تو یہ ہے کہ آپ کے بعد پُوری دنیا میں اگر کوئی شخص قوّی اور زور آور ہے تو وُہ بہمَن ہے۔"

اُدھر بہمَن زخموں سے چور خُون میں ڈوبا ہوا جب اپنے محل میں پہنچا تو نوشیرواں نے اُس کا استقبال کیا اور نہایت شاندار خلعت منگا کر اُس کے آگے رکھا۔ بہمَن حیران ہو کر کہنے لگا:

"اے شہنشاہ تُو مُجھ سے مذاق کرتا ہے کہ میرے لیے خلعت منگواتا ہے۔ آخر یہ کِس خوشی میں؟"

"اِس لیے کہ تُو میدانِ جنگ سے فتح پا کر لوٹا ہے۔" ژوپین نے کہا۔

یہ سُن کر بہمَن بے حد غمگین ہوا اور کُچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز دونوں لشکروں نے پھر صفیں باندھیں اور اپنی اپنی جگہ جم گئے۔ نقّارے زور شور سے بجے۔ اتنے میں بہمَن میدان میں آیا اور للکارنے لگا کہ

کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔ امیر حمزہ نے یہ للکار سُن کر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور دیکھا کہ لِندھور اپنے گھوڑے سے اُتر کر اُن ہی کی طرف آرہا ہے۔ وہ حمزہ کے رُوبرو آیا۔ تین بار زمین چُومی اور کہنے لگا ”بھائی حمزہ اگر اجازت ہو تو میدان میں جاؤں اور بہمَن سے دو دو ہاتھ کروں؟“ امیر حمزہ نے مُسکرا کر کہا:

”میں جانتا تھا کہ تم بہمَن سے لڑے بغیر نہ رہو گے۔ اِس لیے تمہیں روکنا بے کار ہے۔ جاؤ خُدا تمہارا نگہبان ہو۔“

لِندھور نے سلام کیا، پلٹ کر گھُوڑے پر سوار ہُوا اور بہمَن کے سامنے پہنچا۔ بہمَن نے لِندھور کو دیکھا تو جسم پر کپکپی چھُوٹ گئی۔ اگرچہ لِندھور کو پہلے بھی دیکھ چُکا تھا مگر انجان بن کہ پُوچھنے لگا:

”اے کالے شخص، تُو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں جو مُجھ سے لڑنے چلا آیا؟“

”میرا نام لِندھور ہے اور میں سراندیپ کے ہزار جزیرے کا بادشاہ ہوں اور اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔“

”اے لِندھور، میں نے تیرا نام سُنا ہے، تُو واقعی بہادُر اور جواں مرد ہے۔ اب دیر نہ کر اور ہتھیار سنبھال کر سامنے آ۔“

”پہلے وار کرنا ہمارا قاعدہ نہیں۔“ لِندھور نے کہا۔

”بہت اچھا، خبردار ہو کہ میں وار کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بہمَن نے دس من وزنی گُرز گھُما کر لِندھور کے سر پر مارا۔ کہتے ہیں کہ اِس کی ضرب اتنی سخت تھی کہ اگر کِسی چٹان پر پڑتا تو اُس کے بھی ہزار ٹکڑے ہو جاتے لیکن لِندھور مُسکراتا رہا۔ یہ دیکھ کر بہمَن کے چھکّے چھُوٹ گئے۔ دوسرا وار کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ تب لِندھور نے گھوڑا بڑھایا اور اپنا گُرز ایک ہولناک آواز کے ساتھ ہوا میں گھُما کر بہمَن پر وار کیا۔ بہمَن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہڈّیاں پسلیاں سُرمہ بن جاتیں مگر اُس نے اِس وار کو روکا اور کہنے لگا:

”اے لِندھور، آفرین ہے تیری قوّت پر۔ آج تجھ سے لڑ کر جی خوش ہو گیا۔“

اِس کے بعد دونوں میں ایسی خوت ناک اور خُون ریز جنگ ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ لِندھور کا جسم خُون میں نہا گیا۔ اُدھر بہمَن کے بدن کا کوئی حصّہ ایسا نہ تھا جو زخمی ہونے سے بچ گیا ہو۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیّار نہ تھا۔ یہاں تک کہ سورج نے مایوس ہو کر مغرب کے پردے میں اپنا روشن چہرہ چھُپا لیا۔ تب بہمَن نے کہا:

”اے لِندھور، رات سر پر آئی۔ تُو بھی تھک گیا ہے اور میں بھی بدحواس ہوں۔ لڑائی موقوف کر، میں کل پھر میدان میں آؤں گا۔“

یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے لشکر میں چلا گیا۔ لِندھور بھی پُر جوش نعروں اور ڈھول تاشوں کی گُونج میں واپس آیا اور امیر حمزہ کے قدموں کو بوسہ دیا۔ حمزہ نے لِندھور کو محبّت سے گلے لگایا اور کہا: ”اے لِندھور۔ آفرین ہے تجھ پر۔ تُو نے بہمَن کو کیسا پایا؟“

”ویسا ہی پایا جیسا عامِر نے کہا تھا۔“ لِندھور نے جواب دیا۔

اگلے روز پھر میدانِ جنگ میں وہی سماں تھا۔ دونوں فوجیں اور دونوں طرف کے جنگ جُو لڑنے مرنے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ امیر حمزہ اور اُن کے ساتھی بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں نکلے۔ اچانک شمال کی جانب سے گرد کے بادل اُٹھتے نظر آئے۔ پھر اِن بادلوں کا سینہ چاک ہُوا اور ایک عظیم لشکر آتا دکھائی دیا۔ امیر حمزہ نے فوراً چند ہرکاروں کو روانہ کیا کہ وہ خبر لائیں یہ لشکر کِس کا ہے؟ ہرکارے گئے اور واپس آئے اور اُنھوں نے بتایا:

”حضور یہ لشکر فرہاد بن لِندھور کا ہے۔ لِندھور کا بیٹا اپنے باپ سے ملنے آیا ہے۔“

یہ سُن کر امیر حمزہ اور اُن کے سبھی دوست خُوش ہوئے اور لِندھور کو مبارک باد دی۔ اِتنے میں فرہاد نمودار ہُوا۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا اور اُس کا سیاہ چہرہ دُور سے نظر آتا تھا۔ اُس نے جُونہی اپنے باپ لِندھور کر دیکھا، ہاتھی پر سے کُودا اور دوڑتا ہُوا آیا۔ لِندھور کے پیروں پر گرا۔

لِندھور نے اُسے سینے سے لگا کر پیار کیا، پھر امیر حمزہ سے مِلایا۔ اُنھوں نے بھی اُسے گلے سے لگایا اور غلاموں کو حکم دیا کہ فرہاد کو عزّت و احترام سے میرے خاص خیمے میں لے جا کر ٹھہرائیں اور کِسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں۔

تب فرہاد نے میدانِ جنگ پر سرسری نظر ڈالی اور بہمَن کو مقابلے کے لیے تیّار پایا۔ وہ اپنے باپ سے پوچھنے لگا: ”یہ پہلوان جواں مرد کون ہے؟“

”بیٹا، اِس کا نام بہمَن ہے اور مُلک کوہستان کا نام ور بادشاہ ہے۔ پہلے روز اِس کی لڑائی عامِر سے ہوئی، دوسرے روز مُجھ سے اور آج تیسرا روز ہے۔“

”اگر اجازت ہو تو میں اِس کے مقابلے میں جاؤں۔“ فرہاد نے کہا۔

تب لِندھور نے سوالیہ نظروں سے امیر حمزہ کی جانب دیکھا۔ اُنھوں نے فرہاد کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا:

”تم بھی میرے عزیز بیٹے ہو۔ اِتنی دُور کا سفر طے کر کے آ رہے ہو۔ ابھی تم نے کُچھ کھایا نہ پیا۔ میں تمھیں کیوں کر بہمَن سے لڑنے کے لیے بھیج دُوں۔“

لیکن فرہاد نہ مانا۔ لِندھور نے بھی اپنے بیٹے کی سفارش کی۔ آخر امیر حمزہ نے کہا:

"جاؤ فرزند، تمھیں خُدا کے حوالے کیا۔ ذرا دیکھ بھال کر لڑنا۔"

پس فرہاد خوشی خوشی اپنے ہاتھی پر سوار ہُوا اور میدان میں آیا۔ بہمَن نے اُس پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور بولا: "اے جوان تُو کون ہے؟ میں نے پہلے تجھے نہیں دیکھا۔ اپنا نام بتا تھا تا کہ بے نشان نہ مارا جائے۔"

فرہاد مُنہ کھول کر زور سے ہنسا اور کہنے لگا:

"اے بہمَن، سُن کہ میرا نام فرہاد ہے اور میں سراندیپ کے بادشاہ لِندھور کا بیٹا ہوں؟"

"آہا۔۔۔ تیرا باپ واقعی بڑا جی دار ہے اور تو بھی یقیناً ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہے۔ مگر بہتر یہی ہے کہ مُجھ سے لڑنے کے لیے اپنے باپ کو بھیج۔"

اِس مرتبہ فرہاد نے قہقہہ لگایا اور کہا: "اے بہمَن، تُو اِتنا بڑا پہلوان نہیں ہے

کہ میرا باپ بار بار تجھ سے لڑنے آئے گا۔"

اِتنا سُننا تھا کہ بہمَن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ایک زبردست نعرہ مار کر فرہاد پر حملہ آور ہُوا۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور بھاگ دوڑ سے زمین خُشک پتّے کی طرح کانپنے لگی۔ بہمَن نے تین چار حملے اِس زور سے کیے کہ شیر کا پِتّا بھی پانی بن کر بہہ جاتا۔ لیکن فرہاد بھی جرّی باپ کا بیٹا تھا۔ وہ ذرا نہ گھبرایا بلکہ پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ بہمَن سے لڑنے لگا۔ آخر بہمَن پُکار اُٹھا کہ تُو واقعی لِندھور کا بیٹا ہے۔ لڑتے لڑتے دونوں پہلوان تھک کر بے حال ہوئے اور سُورج ڈوبنے کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں پر آکر دم لیا۔

بہمَن کی شکست

چوتھے روز صُبح سویرے بہمَن کی فوج سے نقّارے بجنے کی آواز سُنائی دی۔ امیر حمزہ نے اپنے غلاموں کو بھی حکم دیا کہ تمام ڈھول تاشے اور نقّارے بجائے جائیں۔ تب پہلوانوں نے جسموں پر ذرّہ باندھی، ہتھیار لگائے اور گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار ہو کر میدانِ جنگ کا رُخ کیا۔ بہمَن بھی بڑی شان وشوکت کے ساتھ آیا اور للکار کر کہا:

"جس کو اپنے بازوؤں کی قُوّت پر ناز ہو وہ سامنے آجائے۔"

تب عادی پہلوان نے سینہ پھُلایا اور مست ہاتھی کی طرح جھُومتا ہوا بہمَن کے سامنے پہنچا۔ بہمَن نے حیرت کی نظر سے عادی کو دیکھا اور ہنس کر بولا:

"تُو آدمی ہے یا گوشت پوست کا چلتا پھرتا پہاڑ؟ ذرا اپنی توند کو تو دیکھ۔ تیرے قابُو سے باہر نِکلی جا رہی ہے۔ آخر تُو کِس برتے پر مُجھ سے لڑے گا؟"

عادی نے ناراض ہو کر کہا:

"دیکھ۔۔۔ تُو بادشاہ ہو گا تو اپنے ملک اور اپنے گھر میں ہو گا۔ ہم سے ایسا بے ہودہ مذاق کرنے کا تجھے کوئی حق نہیں۔ جانتا نہیں کہ میرا نام عادی کرب ہے اور میں حمزہ کا دُودھ شریک بھائی ہوں؟"

"آخّاہ۔۔۔ تو آپ ہیں عادی پہلوان۔" بہمَن نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے آپ کی تعریف ژوپین اور بختک کی زبانی سُنی ہے۔ آپ تو بھُنا ہُوا سالم اُونٹ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ واپس چلے جائیں اور جا کر پیٹ پوجا کریں۔ لڑائی بھڑائی آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اے بہمَن زیادہ ٹر ٹر نہ کر اور مُجھے تاؤ نہ دِلا۔ ورنہ قسم ہی پیدا کرنے والے کہ تجھے کچّا چبا جاؤں گا۔ تجھے معلُوم ہونا چاہیے کہ حمزہ کے لشکر کا امیر بھی

ہوں۔ اگر مَیں سالم بھُنا ہُوا اُونٹ ہڑپ کر تا ہوں تو اِس میں کِسی کے باپ کا کیا اجارہ ہے؟"

یہ سُن کر بہمَن کو غصّہ آیا اور کہنے لگا:

"عادی پہلوان تُو تو گالیوں پر اُتر آیا۔ حمزہ بہت نادان شخص ہے کہ تجھ جیسے بد تمیز کو اپنے لشکر کا امیر بنا رکھا ہے۔ اگر تجھے باورچی خانے میں رکھا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا کہ ہر وقت جبڑا اچلاتا اور خُوش رہتا۔ اب یہ بڑی سی توند لے کر میدان میں آنا تیرے لیے قیامت ہی تو ہے۔"

"او کوہستانی وحشی، اپنی زبان کو لگام دے؟" عادی نے لال پیلا ہو کر کہا۔ "میں صبر سے کام لے رہا ہوں اور تو سر پر چڑھا آتا ہے۔ کوئی وار ہے تو پیش کر۔"

"لے پیٹو، خبر دار ہو۔" یہ کہہ کر بہمَن نے اِس مرتبہ پندرہ مَن وزنی گُرز اُٹھایا اور اپنے ہاتھی کو قریب لا کر اِس زور سے عادی کے سر پر گُرز مارا کہ اُس

کی آواز کوسوں دُور تک گئی اور کئی سپاہی صدمے سے بے ہوش ہوئے۔ عادی کا ہاتھی ایک طرف گھُوم گیا اور خود عادی کے اوسان خطا ہو گئے، مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دِل میں اقرار کیا کہ بہمَن واقعی قوّت رکھتا ہے۔ تب عادی نے اپنے گُرز کو حرکت دی اور ایسا ہاتھ مارا کہ بہمَن اپنے ہاتھی سے لڑھک کر زمین پر جا گرا۔ ہاتھی بے تحاشا ایک طرف کو بھاگ نِکلا۔ یہ دیکھ کر عادی بھی اپنے ہاتھی سے کُودا اور بہمَن کے سر پر جا پہنچا۔ بہمَن نے زمین پر پڑے پڑے ایسا اڑنگا مارا کہ عادی دھم سے زمین پر گرا۔ پھر دونوں پہلوان آپس میں گُتھم گُتھا ہو گئے اور ایسی گھونسے بازی ہوئی کہ دیکھنے والوں نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔ آخر دونوں پہلوان بے ہوش ہوئے اور اُن کے آدمی اُنہیں اُٹھا کر اپنے اپنے لشکر میں لے آئے۔

ہوش آیا تو عادی پہلوان نے اپنے آپ کو آرام دہ بستر پر پایا۔ اُس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اُسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل تھا۔ امیر حمزہ نے پوچھا:

"کیوں عادی بھائی، تُم نے بہمَن کو کیسا پایا؟"

”جناب وہ لندھور سے دس گنا زیادہ قوّی ہے۔“ عادی نے کراہتے ہوئے کہا۔

اگلے روز عادی پہلوان کے چھوٹے بھائی اوبد پہلوان، آشوب، سعد یمانی وغیرہ میدان میں اُترے لیکن بہمَن نے اِن سب کو پچھاڑا اور باندھ کر اپنے لشکر میں بھیج دیا۔ آخر استفتانوش پہلوان نمودار ہوا اور کئی گھنٹے تک اُس کی اور بہمَن کی خوف ناک جنگ ہوئی مگر ہار جیت کے بغیر ختم ہو گئی۔

چھٹے روز پھر اکھاڑا جما اور اِس مرتبہ سلطان بخت مغرب نے بہمَن سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ بہمَن نے پُکار کر کہا:

”حمزہ اپنے دوستوں کو میدان میں بھیجتا ہے اور خُود بُزدِلوں کی طرح چھُپا بیٹھا ہے۔ جرأت ہے تو سامنے آئے۔“

یہ چیلنج سُن کر امیر حمزہ نے سلطان بخت مغربی کو روکا اور مُقبِل وفادار کو حکم دیا کہ ”ہمارا لباس اور ہتھیار لاؤ۔“

حمزہ نے پہلے حضرت اسماعیلؑ کا کُرتا پہنا۔ اس کے بعد داؤدؑ کی زرہ اور ہُود نبیؑ

کا خُود سر پر رکھ کر صالح پیغمبرؑ کے موزے پیروں پر چڑھائے۔ دائیں بائیں صمصام اور قمقام نامی تلواریں لگائیں۔ سام بن نریماے کا فولادی گُرز ہاتھ میں سنبھالا۔ سیاہ قیطاس کی بجائے اشقر دیوزاد پر سوار ہوئے اور میدان میں نکلے۔ اشقر دیوزاد کی چال جس نے دیکھی عش عش کر اُٹھا۔ خود بہمَن پر بھی امیر حمزہ کو دیکھ کر سکتے کا عالم طاری ہوا، حیرت سے کہنے لگا:

"اے جوان تُو کون ہے؟ میں نے تو حمزہ کو بُلایا تھا۔"

"میں ہی حمزہ ہوں۔"

"تعجّب ہے کہ تو نے اِس عام قد و قامت اور قوّت کے ساتھ دنیا بھر کے پہلوانوں کو کیوں کر زیر کیا۔" بہمَن نے کہا۔

"خُدا کی قدرت اور اُس کے فضل سے۔" حمزہ نے جواب دیا۔ "اب زیادہ باتیں مت بنا اور جو ہُنر رکھتا ہے وہ دِکھلا۔"

تب بہمَن اپنا اٹھارہ من وزنی گُرز اُٹھا کر سر سے اُونچا لے گیا اور دونوں پاؤں

رکاب میں پھنسا کر اِس زور سے امیر حمزہ کے سر پر مارا کہ اُس کی آواز سے کوہ و بیابان لرز اُٹھے۔ حمزہ نے ڈھال پر یہ وار روکا مگر کچھوے کی ہڈّی کی بنی ہوئی ڈھال چیخ گئی۔ بہمَن بے اختیار پُکار اُٹھا: ”آفرین ہے تجھ پر۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔“

”تجھ کو دو حملے اور دِیے۔“ امیر حمزہ نے کہا۔

بہمَن نے دو وار اور اِس شدّت سے کیے کہ پہاڑ بھی ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن خُدا کے فضل سے امیر حمزہ کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اب حمزہ نے سام بن نریمان کا گُرز ہوا میں گھُمایا۔ اس کے گھومنے سے میدان میں آندھی کی سی کیفیّت پیدا ہوئی اور بہمَن دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ حمزہ نے پُکار کر کہا:

”اے بہمَن اب پیچھے کیوں ہٹتا ہے؟ آگے بڑھ اور میرا وار روک۔“

یہ کہہ کر حمزہ نے اِس قوّت سے گُرز مارا کہ بہمَن کے گھوڑے کی کمر کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔ بہمَن خاک پر ِگرا مگر فوراً ہی اُٹھ کر تلوار کھینچی اور اشقر دیو زاد کی

ٹانگیں کاٹنے کے ادارے سے لپکا لیکن اشقر نے ایسی دولتّی جمائی کہ ہو لُڑھکنیاں کھاتا ہُوا دُور جاگرا۔ تب حمزہ نے سلیمانی کوڑا نِکالا اور بہمَن پر برسانا شروع کیا۔ کوڑا لگتے ہی وہ جنگلی بھینسے کی طرح ڈکراتا اور اِدھر اُدھر بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کرتا۔ مگر سلیمانی کوڑا اُس کی خوب مرمّت کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر بہمَن کی ناک، کانوں اور مُنہ سے خون جاری ہُوا اور وہ زمین پر گِر کر تڑپنے لگا اور امان مانگنے لگا۔ تب حمزہ نے اپنا ہاتھ روکا۔ عُمرو عیّار دوڑا دوڑا آیا اور بہمَن کو باندھ کر اپنے لشکر میں لے گیا۔

حمزہ نے طبیب اقلیموں کو حکم دیا کہ بہمَن کے زخموں کا علاج کیا جائے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے اپنی فوج سے کہا کہ کوہستان کا محاصرہ کرلو اور بغیر اجازت کِسی کو بھاگنے کا موقع نہ دو۔ اپنے بادشاہ بہمَن کو قید میں جاتے دیکھ کر کوہستانی فوجوں اور پہلوانوں کے جی چھُوٹ گئے اور اُنہوں نے لڑنے بھڑنے کے بجائے ہتھیار ڈال دیے۔ عُمرو عیّار نے اپنا خنجر تیز کیا اور حمزہ سے کہنے لگا کہ میں اب نوشیرواں، ژوپین اور بختک کی تلاش میں جاتا ہوں اور اُن کے سر

کاٹ کر لاتا ہوں۔ امیر حمزہ نے اُسے ڈانٹا کہ یہ حرکت ہماری شان کے خلاف ہے۔ اِس لیے یہ خیال دِل سے نکال دو۔

کئی دِن بعد جب بہمَن کے زخم بھر آئے اور وُہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو امیر حمزہ نے اُسے اپنے پاس بُلایا۔ بڑی عزّت سے سونے کی عالی شان کُرسی پر بٹھایا اور کہا:

"کیوں بہمَن، تُو نے ہم کو کیا پایا؟"

"بہادر، شریف اور جرّی۔" بہمَن نے جواب دیا۔

"اب آیندہ کیا اِرادے ہیں؟" حمزہ نے پوچھا۔

"دینِ ابراہیمی میں داخل ہوتا ہوں اور آیندہ سے آپ کا جان نثار خادم بن کر رہوں گا۔" بہمَن نے جواب دیا۔

یہ سُن کر لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور امیر حمزہ نے بہمَن کو گلے سے لگا لیا۔ تب بہمَن نے کہا کہ "اے امیر میری خواہش ہے کہ ژوپین،

نوشیر واں اور بختک وغیرہ بھی دینِ ابراہیم میں داخل ہوں، آگ کو پوجنا
چھوڑ دیں اور ایک خُدا پر ایمان لائیں۔ یہی صُورت اُن کی جان بخشی کی ہے
ورنہ قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ اپنے ہاتھ سے اُنہیں قتل کروں گا۔"

امیر حمزہ نے اُسی وقت نوشیر واں، ژوپین اور بختک کو طلب کیا۔ اُن کے
چہرے موت کے خوف سے اُترے ہوئے تھے۔ لیکن جب بہمَن نے اُنہیں
بتایا اگر دینِ ابراہیمی پہ ایمان لاؤ تو محفوظ رہو گئے تو خوش ہوئے۔ فوراً ایمان
لے آئے اور امیر حمزہ سے اپنے قصور کی معافی چاہی۔ امیر حمزہ نے انتہائی
فراخ دِلی سے کام لیتے ہوئے سب کو معاف کیا اور نوشیر واں کی اُسی طرح
عزّت کی جس طرح پہلے کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایمان لانے کے بعد
بہمَن، نوشیر واں، بختک اور ژوپین کے دِلوں کی سیاہی دُور ہو جائے گی اور یہ
کوئی سازش نہ کریں گے، مگر وہ اُن کے دِلوں کی حالت سے بے خبر تھے۔
ظاہری طور پر یہ لوگ جانیں بچانے کے لیے ایمان لے آئے تھے مگر دِل
میں امیر حمزہ کے خلاف سخت دُشمنی اور حسد رکھتے تھے اور اُنھوں نے طے کیا

تھا کہ خواہ کُچھ ہو وہ حمزہ کو ہلاک کیے بغیر نہ مانیں گے۔

امیر حمزہ کی شدّاد جادوگر سے جنگ۔۔۔۔ عامِر بہمَن کو قتل کرتے ہیں مگر بعد میں خُود بھی شہید ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ ملکہ مِہر نگار کی وفات اور نوشیر واں کا تخت و تاج چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جانا۔ یہ واقعات داستانِ امیر و حمزہ کی چھٹی کتاب ''شدّاد جادوگر'' میں پڑھیے۔ انتہائی دلچسپ، پُراسرار اور حیرت انگیز کہانی ہے۔